عقیدہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام

افادات

مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ
متکلم اسلام

مرکز اھل السنۃ والجماعۃ سرگودھا پاکستان

چند تمہیدی باتیں:

ا: نبی کی تعریف:

إِنْسَانٌ مَبْعُوثٌ مِنَ اللهِ مَعْصُوْمٌ عَنِ الْخَطَإِ مَفْرُوْضُ الإِتِّبَاعِ.

ترجمہ: نبی اس انسان کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجا گیا ہو، خطا سے معصوم ہو اور اس کی پیروی کرنا فرض ہو۔

انسان کی تعریف:

شاہ عبد القادر محدث دہلوی رحمہ اللہ (ت1230ھ) سورۃ الحجر آیت نمبر 28 ﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾﴾ کی تشریح میں فرماتے ہیں:

”بشر وہ جو بدن رکھے کہ ہاتھ سے پکڑا جاوے اور روح رکھے ہوشیار۔ اگلے مخلوقات یا حیوان تھے جن کو ہوش نہیں، یا فرشتے یا جن تھے جن کا بدن نہ پکڑا جاوے“

(موضح القرآن از شاہ عبد القادر محدث دہلوی: ص 341)

فائدہ: میں اپنے لفظوں میں اس کا مفہوم یوں ادا کرتا ہوں کہ انسان کی تعریف میں دو چیزیں ہیں:

1: ذو عقل ”صاحب عقل“ ہو۔

2: محسوس ہو۔ اس کو چھونا چاہیں تو چھو سکیں، پکڑنا چاہیں تو پکڑ سکیں۔

- ذو عقل کی دو قسمیں ہیں: 1: کامل 2: ناقص ذو عقل کامل ”مرد“ اور ناقص ”عورت“ ہے۔
- عورت کا ناقص العقل اور ناقص دین ہونا:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ خَرَجَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَضْحًى أَوْ فِطْرٍ إِلَى الْمُصَلَّى فَمَرَّ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ: "يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَإِنِّي أُرِيتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ." فَقُلْنَ: وَبِمَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: "تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ، مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِينٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ." قُلْنَ: وَمَا نُقْصَانُ دِينِنَا وَعَقْلِنَا يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: "أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ؟" قُلْنَ: بَلَى! قَالَ: "فَذٰلِكِ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِهَا. أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟" قُلْنَ: بَلَى! قَالَ: "فَذٰلِكِ مِنْ نُقْصَانِ دِينِهَا."

(صحیح البخاری: ج1 ص44 کتاب الحیض باب ترک الحائض الصوم)

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے لیے عید گاہ کی طرف تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے پاس گزرے تو فرمانے لگے: اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ و خیرات کیا کرو، مجھے دکھایا گیا ہے کہ تمہاری جہنم میں اکثریت ہے۔ عورتیں کہنے لگیں: یا رسول اللہ! وہ کیوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ تم گالی گلوچ بہت زیادہ کرتی ہو اور خاوند کی نافرمانی کرتی ہو، میں نے دین اور عقل میں تم سے زیادہ ایسا ناقص کوئی نہیں دیکھا جو ایک اچھے بھلے شخص کی عقل کو خراب کر دے۔ عورتیں کہنے لگیں: یا رسول اللہ! ہمارا دین اور ہماری عقل میں نقص کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا عورت کی گواہی مرد کی نصف گواہی کے برابر نہیں؟ وہ کہنے لگیں: کیوں نہیں! پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو یہ اس کی عقل کا نقصان ہے اور جب کسی عورت کو ایام آ جائیں تو کیا وہ نماز اور روزہ نہیں چھوڑتی؟ عورتیں کہنے لگیں: کیوں نہیں! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یہی اس عورت کے دین کا نقصان ہے۔

فائدہ: اھل بدعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر نہیں مانتے۔ اگر بشر کا معنی سمجھ میں آجائے تو اختلاف ختم ہو جائے گا۔

مبعوث من اللہ:

نبوت وھبی ہے نہ کہ کسبی، یہ سلیکشن سے ملتی ہے نہ کہ الیکشن سے۔ "الیکشن" کہتے ہیں جسے لوگ چنیں، چھوٹے منتخب کریں اور "سلیکشن" کہتے ہیں جسے حکومت چنے، بڑا خود منتخب کرے۔

فائدہ:

"وھبی" کا معنی ہے کہ عطاءِ نبوت میں عبادات' ریاضات اور مشقتوں کو دخل نہیں، محض اللہ تعالیٰ کے عطا فرمانے سے ملتی ہے۔

"کسبی" کا معنی ہے کہ ریاضت و عبادت کرکے آدمی نبی بن سکتا ہے۔

معصوم عن الخطا:

خطا کے کئی معانی ہیں:

1: مسئلہ قتل میں خطاء؛ عمد کے مقابلے میں ہوتی ہے یعنی قتل عمد اور قتل خطا

قتل عمد کی تعریف:

فَالْعَمْدُ مَا تَعَمَّدَ ضَرْبَهُ بِسِلَاحٍ أَوْ مَا أُجْرِيَ مُجْرَى السِّلَاحِ كَالْمُحَدَّدِ مِنَ الْخَشَبِ وَلِيطَةِ الْقَصَبِ وَالْمَرْوَةِ الْمُحَدَّدَةِ وَالنَّارِ.

(الہدایۃ لعلی بن ابی بکر بن عبد الجلیل: ج4 ص553 کتاب الجنایات)

ترجمہ: قتل عمد یہ ہے کہ ہتھیار یا ہتھیار کے قائم مقام چیز سے کسی کو مارنے کا ارادہ کیا جائے جیسے دھاری دار لکڑی، بانس کا چھلکا، دھار دار پتھر اور آگ۔

قتل خطا کی تعریف:

وَالْخَطَأُ عَلَى نَوْعَيْنِ، خَطَأٌ فِي الْقَصْدِ وَهُوَ أَنْ يَرْمِيَ شَخْصًا يَظُنُّهُ صَيْدًا فَإِذَا هُوَ آدَمِيٌّ أَوْ يَظُنُّهُ حَرْبِيًّا فَإِذَا هُوَ مُسْلِمٌ وَخَطَأٌ فِي الْفِعْلِ وَهُوَ أَنْ يَرْمِيَ غَرَضًا فَيُصِيبَ آدَمِيًّا.

(الہدایۃ لعلی بن ابی بکر بن عبد الجلیل: ج4 ص556 کتاب الجنایات)

ترجمہ: قتل کی دو قسمیں ہیں؛ ایک خطا فی القصد کہ آدمی کسی شکار کا نشانہ بنا رہا تھا اور وہ انسان نکلا یا کسی حربی کافر کو مار رہا تھا اور وہ مسلمان نکلا۔ دوسری قسم خطا فی الفعل ہے کہ آدمی کسی اور چیز کو نشانہ لگائے اور وہ آدمی کو لگ جائے۔

2: حالت روزہ میں خطاء؛ نسیان کے مقابلے میں ہوتی ہے یعنی "نسیان" کا معنی بھول جانا اور "خطاء" کا معنی کوتاہی کرنا۔

3: اجتہاد میں خطاء؛ صواب کے مقابلے میں ہوتی ہے

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ."

(صحیح البخاری: ج2 ص1092 کتاب الاعتصام باب أجر الحاكم إذا اجتهد فأصاب أو أخطأ)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب حاکم فیصلہ کرتے

ہوئے اجتہاد کرتا ہے اور اجتہاد درست کرتا ہے تو اسے دو اجر ملتے ہیں اور جب فیصلہ کرتے ہوئے اجتہاد کرتا ہے اور اجتہاد میں غلطی کرتا ہے تو اسے ایک اجر ملتا ہے۔

4: ہمارے عرف میں خطاء کئی معانی میں استعمال ہوتی ہے مثلاً بھولنا، غلطی کرنا، کوتاہی کرنا وغیرہ

5: عصمت نبوت کے باب میں جب یہ بات کہیں کہ نبی معصوم عن الخطا ہوتا ہے تو یہاں "خطا" سے مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ نبی کے معصوم عن الخطاء ہونے کا معنیٰ یہ ہو گا کہ نبی نبوت ملنے سے پہلے اور نبوت ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتا۔ "نافرمانی" کا معنی ہے کہ بلا عذر جان بوجھ کر کسی کی بات کو نہ ماننا۔ اگر عذر، بھول چوک یا بات سمجھنے میں غلطی لگی ہو تو یہ "نافرمانی" نہیں ہو گی۔

مفروض الاتباع:

جس کی ہر بات ماننا فرض و ضروری ہو۔

"اتباع" یہ "تبیعة" سے ہے اور "تبیعة" جانور کے اس بچے کو کہتے ہیں جو ماں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کدھر جاتی ہے، یہ نہیں دیکھتا کہ ماں کیوں جاتی ہے؟! نبوت کی اتباع بھی یوں کی جائے کہ ہر حکم کو من و عن تسلیم کر کے عمل کیا جائے، سمجھ میں آئے تب بھی مانیں اور سمجھ میں نہ آئے تب بھی مانیں۔

صحابی کی تعریف:

جس میں تین باتیں پائی جائیں اسے صحابی کہتے ہیں:

1: مومن ہو۔

2: حالت ایمان میں نبی سے ملاقات کرے۔

3: ایمان کی حالت میں وفات ہو۔

حافظ ابو الفضل احمد بن علی المعروف ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ت 852ھ فرماتے ہیں:

وَهُوَ مَنۡ لَقِيَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ مُؤۡمِنًا بِهٖ وَمَاتَ عَلَى الۡإِسۡلَامِ.

(نزھۃ النظر شرح نخبۃ الفکر لاحمد بن علی بن حجر العسقلانی متوفی 852ھ: ص 133)

ترجمہ: صحابی اس شخص کو کہتے ہیں جو حالت ایمان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور حالت اسلام ہی پر فوت ہو جائے۔

فائدہ نمبر 1: یہاں لفظ لَقِيَ؛ لِقَاء سے ہے، یہاں نہ لفظ بصر ہے بمعنی دیکھنا، نہ کلام ہے بمعنی بات کرنا اور نہ سمع ہے بمعنی سننا۔ لہذا اگر کوئی اجتماع میں آ جائے تو وہ بھی "لِقَاء" میں شامل ہے۔

فائدہ نمبر 2: یہاں "لِقَاء" کا لغوی معنی؛ ملاقات مراد نہیں بلکہ "لِقَاء" کا عمومی معنی "مجمع میں آنا اسی طرح بغیر بات کئے آمنے سامنے آنا وغیرہ" مراد ہے۔ چنانچہ پیغمبر علیہ السلام سے اگر براہِ راست ملاقات ہوئی ہو یا مجمع میں اجتماعی طور پر ملاقات ہوئی ہو تو یہ سب "لِقَاء" میں شامل ہیں۔

مجتہد کی تعریف:

امام ابو عبد اللہ محمد بن محمد المعروف با بن امیر حاج الحنفی (ت 879ھ) لکھتے ہیں:

هُوَ الۡبَالِغُ الۡعَاقِلُ ذُوۡ مَلِكَةٍ يَقۡتَدِرُ بِهَا عَلَى اسۡتِنۡتَاجِ الۡأَحۡكَامِ مِنۡ مَآخِذِهَا.

(التقریر والتحریر فی علم الاصول:ج3ص388 المقالۃ الثالثۃ فی الاجتہاد)

ترجمہ:(مجتہد وفقیہ)وہ عاقل بالغ مسلمان جو ایسا ملکہ (صلاحیت) کا حامل ہو جس کے ذریعے وہ استنباطِ احکام کی قدرت رکھتا ہو۔

فائدہ:

مختلف اصحاب علم نے مجتہد کی جو تعریفات بیان کی ہیں انہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجتہد کی تعریف میں چار چیزیں ملحوظ ہوتی ہیں۔

1: کتاب اللہ کے الفاظ اور اس کے معانی جانتا ہو

2: سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسانید ومتون اور معانی جانتا ہو

3: قیاس میں مصیب ہو

4: عرف، سوسائٹی اور معاشرہ کو جانتا ہو۔

{تنقیحات متکلم اسلام}

سوال: مجتہد کی تعریف میں "مصیب فی القیاس" ہے حالانکہ مجتہد کبھی مخطی بھی ہوتا ہے!

جواب: "مصیب فی القیاس" کا مطلب ہے "مصیب فی القیاس فی ظنہ"، فی الواقع بے شک خطا پر ہو۔

فائدہ: عرف اور معاشرہ کو اجتہادی مسائل حل کرنے میں دخل ہے۔

مثال:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَدْ جَاءَ ابْنُ النَّوَّاحَةِ وَابْنُ أُثَالٍ رَسُولَيْنِ لِمُسَيْلِمَةَ إِلَى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُمَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "تَشْهَدَانِ أَنِّي رَسُولُ اللهِ؟" فَقَالَا: نَشْهَدُ أَنَّ مُسَيْلِمَةَ رَسُولُ اللهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "آمَنْتُ بِاللهِ وَرُسُلِهِ لَوْ كُنْتُ قَاتِلًا رَسُولًا لَقَتَلْتُكُمَا". قَالَ عَبْدُ اللهِ: فَمَضَتِ السُّنَّةُ بِأَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ."

(سنن ابی داؤد الطیالسی:ج1ص133 رقم الحدیث248)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسلیمہ کذاب کے دو سفیر عبد اللہ بن نواحہ اور اسامہ بن اُثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے فرمایا: کیا تم دونوں اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں؟ انہوں نے کہا: ہم یہ گواہی دیتے ہیں کہ مسلیمہ اللہ تعالی کا رسول ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، اگر میں کسی قاصد کو قتل کرتا تو تم دونوں کو قتل کر دیتا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ طریقہ یہ جاری ہے کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا رہا۔

فائدہ: نبی معصوم، صحابی محفوظ اور مجتہد ماجور ہوتا ہے۔

نبی معصوم... یعنی اللہ تعالیٰ نبی سے گناہ ہونے نہیں دیتے

صحابی محفوظ... یعنی صحابی سے گناہ ہو جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نامہ اعمال میں رہنے نہیں دیتے

مجتہد ماجور... یعنی مجتہد سے خطا ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی اجر ملتا ہے۔

۲: نبی کی ضرورت:

اللہ تعالی خالق ہم مخلوق، اللہ تعالی مالک ہم مملوک ہیں۔ مخلوق اور مملوک کا حق بنتا ہے کہ اپنے خالق ومالک کی بات مانے اس لئے اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا ضروری ہے۔ اللہ کا حکم اس وقت مانیں گے جب اللہ تعالیٰ کی ذات کو دیکھیں گے یا بات کو سنیں گے۔ اس دنیا میں رہ کر نہ تو ہم نے اللہ کی ذات کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی بات کو سن سکتے ہیں۔ اس لیے ایسے واسطے کی ضرورت ہے جس نے اللہ کی ذات کو دیکھا یا بات کو سنا ہو بالواسطہ یا بلاواسطہ اور وہ رسول اور نبی کی ذات ہے۔

سوال:

اللہ تعالیٰ کی بات نبی بواسطہ فرشتہ سنتا ہے اور ہم بواسطہ نبی سنتے ہیں۔ تو سننے میں تو دونوں واسطوں کے محتاج ہوئے۔

جواب نمبر 1:

یہ صرف نبوت کی خصوصیت ہے کہ وہ براہِ راست خدا کی بات سنے جیسے موسیٰ علیہ السلام یا خدا کی ذات کو دیکھے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، نبوت کے علاوہ کسی بشر کے لیے یہ چیز ثابت نہیں۔ لہذا نبی اور خدا کا معاملہ بلاواسطہ ہے اور امت اور نبی کا معاملہ بالواسطہ ہے۔

جواب نمبر 2:

نبی اور خدا کے درمیان واسطہ فرشتے کا ہوتا ہے جو انسانوں میں سے نہیں اور معصوم بھی ہے کہ خدا نے اس میں گناہ کا تقاضا ہی نہیں رکھا۔ اس لئے فرشتے کا واسطہ ہونا نہ ہونے کے مترادف ہے جبکہ ہمارے اور خدا کے درمیان نبی کا واسطہ ہے۔

دلائل اهل السنة والجماعة

دلیل نمبر 1:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

(سورت الاحزاب: 21)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

فائدہ 1: اسوۂ حسنہ اس وقت بن سکتے ہیں جب خود گناہوں سے پاک ہوں

فائدہ 2: "لَكُمْ" میں خطاب حضرات وخواتین دونوں کو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال جو حضرات کے لیے ہیں وہ ان کے لیے اسوہ حسنہ ہیں اور جو اقوال وافعال جو خواتین کے لیے ہیں وہ ان کے لیے اسوہ حسنہ ہیں۔

تنقیحات متکلم اسلام

دلیل نمبر 2:

﴿وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ

مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ﴾

(سورت یونس:15)

ترجمہ: جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کوئی اور قرآن لے کر آؤ یا اس میں تبدیلی کرو۔ اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں کوئی تبدیلی کروں، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔

فائدہ: اس دلیل کو سمجھنے سے پہلے "تغییر" اور "تبدیل" کا معنی سمجھ لیں۔

تغییر؛ ایک چیز کا رکھ لینا اور دوسری بھی لے آنا۔

تبدیل؛ ایک چیز کو واپس کرکے دوسری لے آنا۔

مثال: ایک شخص اپنے والد کے لئے کپڑے لایا۔ والد صاحب کو پسند نہ ہوں اور وہ شخص یہ کپڑے خود رکھ لے اور والد صاحب کے لیے دوسرے لائے تو اسے "تغییر ثوب" کہیں گے۔ اور اگر وہ کپڑے دکان پر واپس کرکے دوسرے لے آئے تو اسے "تبدیل ثوب" کہیں گے۔

تنقیحات متکلم اسلام

سورۃ یونس کی آیت 15 میں "تبدیل قرآن" کی نفی کی گئی ہے۔ اور دوسری آیت:

﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿٧٣﴾﴾

(سورۃ الاسراء:73)

ترجمہ: اور (اے پیغمبر) جو وحی ہم نے تمہارے پاس بھیجی ہے، یہ (کافر) لوگ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس سے ہٹانے لگے تھے، تاکہ تم اس کے بجائے کوئی اور بات ہمارے نام پر گھڑ کر پیش کرو، اور اس صورت میں یہ تمہیں اپنا گہرا دوست بنا لیتے۔

میں "تغییرِ قرآن" کی نفی ہے۔ دلیل کا حاصل یہ ہے کہ جب پیغمبر حکم شرعی کو بدل نہیں سکتے تو اس کی خلاف ورزی کیسے کر سکتے ہیں؟!

{تنقیحات متکلم اسلام}

دلیل نمبر 3:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿٣﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿٤﴾﴾

(سورت النجم 3،4)

ترجمہ: اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔

فائدہ: آپ کی ہر بات جب وحی کے مطابق ہے تو اس میں غلطی اور گناہ کا احتمال نہیں ہوگا۔

اشکال:

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی باتوں کو اللہ رب العزت نے ختم فرما دیا جیسے تحریم عسل۔ آپ کی ہر بات وحی کے مطابق ہوتی تو پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس بات پر تنبیہ کیوں فرمائی؟

جواب:

یہ ایسے ہی ہے جیسے آیت منسوخ ہو جائے جس طرح آیت کے منسوخ ہونے سے اس کا غلط ہونا لازم نہیں آتا اسی طرح اجتہاد کے ختم کرنے سے اس کا معصیت ہونا لازم نہیں آتا۔

فائدہ: نبی اور امتی کے اجتہاد میں فرق:

نبی اجتہاد کرتا ہے اور بسا اوقات ان کے اجتہاد میں خطا پائی جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو خطا پر باقی رہنے نہیں دیتے بلکہ وحی نازل کر کے تنبیہ اور اصلاح کر دی جاتی ہے۔ امتی مجتہد بھی اجتہاد کرتا ہے لیکن چونکہ وحی کا دروازہ بند ہے اس لیے اگر امتی مجتہد کے اجتہاد میں خطا پائی جائے تو بسا اوقات وہ اپنی اجتہادی خطا پر آخر تک برقرار رہتا ہے، وحی کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے اسے تنبیہ اور اصلاح نہیں ہو پاتی۔

تنقیحات متکلم اسلام

ایک شیعہ سے مشاجرات صحابہ پہ میری گفتگو ہوئی۔

مکالمہ:

اس نے کہا: حضرت علی اور امیر معاویہ میں سے حق پہ کون اور باطل پہ کون تھا؟

میں نے کہا: دونوں حق ہیں۔

اس نے کہا: جب دو آدمیوں میں لڑائی ہو تو ایک حق دوسرا باطل ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اگر دو نبیوں میں مسئلہ بن جائے تو حق پہ کون ہو گا؟

اس نے کہا: جی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

میں نے کہا: ہو تو پھر؟

اس نے کہا: دونوں حق پہ ہوں گے۔

میں نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے سر اور داڑھی کے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ بتائیں ان میں حق پہ کون تھا؟

اس نے کہا: دونوں حق پہ ہیں۔

میں نے کہا: حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنھما بھی دونوں حق پہ ہیں۔

اس نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام پہ وحی آگئی ساری بات حل ہو گئی۔ غلط فہمی تھی جو دور ہو گئی۔

میں نے کہا: حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنھما میں غلط فہمی کی وجہ سے لڑائی ہوئی دونوں حق پہ تھے۔ لیکن چونکہ وحی کا سلسلہ بند ہے اس لئے معاملہ قتل و قتال تک چلا گیا۔

اس سے تو ہمارا موقف ثابت ہوتا ہے کہ نبی پہ وحی آتی ہے نبی کے علاوہ کسی پہ وحی نہیں آتی۔

تنقیحات متکلم اسلام

دلیل نمبر 4:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾

(سورۃ الحشر:7)

ترجمہ: رسول تمہیں جو حکم دے اس پر عمل کرو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔

فائدہ 1: اس آیت میں امر و نہی میں امت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا پابند کیا گیا ہے اور یہ تب ہو سکتا ہے جب آپ کا ہر امر و نہی معصیت سے پاک ہو۔

فائدہ 2: "اٰتٰی" بمعنی "أَمَرَ" ہے قرینہ مقابلہ میں "نَہٰی" ہے۔ یہاں "اٰتٰی" کا لفظ لائے تاکہ مالِ فیٔ کا حکم اور عام اصول دونوں کو شامل ہو جائے۔

فائدہ 3: امر و نہی جس درجہ میں ہو اسی درجہ میں اطاعت کی جائے گی، کبھی وجوب کے درجہ میں اور کبھی استحباب کے درجہ میں۔

سوال: اطاعت صحابہ رضی اللہ عنہم و مجتہد کیوں کرتے ہو؟

جواب: اس لیے کہ اطاعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اطاعتِ مجتہد بھی اطاعتِ رسول ہی ہے کیونکہ ان کی اطاعت کرنے کا حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔

دلیل نمبر 5:

﴿أَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾

(سورۃ البقرۃ:44)

ترجمہ: کیا تم (دوسرے) لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟!

فائدہ 1: حضرات انبیاء علیہم السلام کا کام قوم کو نیکی کا درس دینا ہے۔ تو اگر خود نافرمان ہو جائیں -معاذ اللہ- تو پھر مقصدِ رسالت کو ختم کر کے آیت بالا کا مصداق بن جائیں گے۔

فائدہ 2: واعظ بے عمل نہ ہو، یہ نہیں کہ بے عمل وعظ ہی نہ کرے۔

فائدہ 3: ایک گناہ کی وجہ سے دوسرا نیک کام نہیں چھوڑنا چاہیے۔

تنقیحات متکلم اسلام

دلیل نمبر 6:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :... "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ."

(صحیح البخاری: ج1 ص21 کتاب العلم باب اثم من کذب علی النبی علیہ السلام)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس آدمی نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنا لے۔

فائدہ: جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی طرف جھوٹ کی نسبت کو گناہ قرار دے رہے ہیں تو خود اس گناہ کے مرتکب کیسے ہو سکتے ہیں؟

دلیل نمبر 7:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ، وَمَنْ يَعْصِنِي فَقَدْ عَصَى اللهَ.

(صحیح مسلم ج2ص124 کتاب الامارۃ باب وجوب إطاعۃ الأمراء فی غیر معصیۃ و تحریمہا فی معصیۃ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔

فائدہ: نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تب ہی ہو سکتی ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود معصیت یعنی نافرمانی سے پاک ہوں۔

دلیل نمبر 8:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ أَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ أَسْمَعُهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُرِيدُ حِفْظَهُ فَنَهَتْنِي قُرَيْشٌ وَقَالُوا: أَتَكْتُبُ كُلَّ شَيْءٍ تَسْمَعُهُ وَرَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَشَرٌ يَتَكَلَّمُ فِي الْغَضَبِ وَالرِّضَا؟ فَأَمْسَكْتُ عَنِ الْكِتَابِ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَوْمَأَ بِإِصْبَعِهِ إِلٰى فِيهِ فَقَالَ: "اُكْتُبْ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ."

(سنن ابی داؤد ج2ص514 کتاب العلم باب فی کتابۃ العلم، مسند احمد ج2ص162 رقم الحدیث 6510)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بات سنتا تھا اس کو لکھ لیا کرتا تھا تاکہ اسے محفوظ کروں۔ قریش نے مجھے اس بات سے روکا اور کہنے لگے کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہر بات لکھ لیتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو انسان ہیں، خوشی اور غمی میں کلام کرتے ہیں۔ تو میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ میں نے یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی تو آپ علیہ السلام نے اپنی انگلی کا اشارہ اپنے منہ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا: تم لکھا کرو! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس منہ سے سوائے حق کے کچھ نہیں نکلتا۔

فائدہ: سب سے زیادہ گناہ عام طور پر زبان سے صادر ہوتے ہیں، اس لیے حدیث پاک میں بطورِ خاص زبان کا ذکر فرمایا ہے وگرنہ پیغمبر کے کسی عضو سے بھی پیغمبر کی نافرمانی نہیں ہوتی۔

فائدہ: اگر کسی کے بارے میں ذہن میں کوئی سوال ہو تو اسی سے رابطہ کر کے پوچھ لینا چاہئے۔ جس طرح حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی۔

دلیل نمبر 9:

أَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ، عَنْ مَعْمَرٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، أَوْ قَتَادَةَ، أَوْ كِلَيْهِمَا: أَنَّ يَهُودِيًّا جَاءَ يَتَقَاضٰى رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "قَدْ قَضَيْتُكَ"، فَقَالَ الْيَهُودِيُّ: "بَيِّنَتَكَ؟"، قَالَ: فَجَاءَ خُزَيْمَةُ بْنُ ثَابِتٍ الْأَنْصَارِيُّ فَقَالَ: أَنَا أَشْهَدُ أَنَّهُ قَدْ قَضَاكَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "وَمَا يُدْرِيكَ؟"، قَالَ: إِنِّي أُصَدِّقُكَ بِأَعْظَمَ مِنْ ذٰلِكَ، أُصَدِّقُكَ بِخَبَرِ السَّمَاءِ، فَأَجَازَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَهَادَتَهُ بِشَهَادَةِ رَجُلَيْنِ.

(مصنف عبد الرزاق: ج10ص228 کتاب الجامع باب اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

ترجمہ: امام زہری یا امام قتادہ یا دونوں سے روایت ہے کہ ایک یہودی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر رقم کا تقاضا کرنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: میں نے تو رقم ادا کر دی ہے۔ یہودی کہنے لگا: اس پر کوئی گواہ بھی ہیں؟ راوی کہتے ہیں کہ حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ آگئے اور فرمانے لگے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رقم ادا کر دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

خزیمہ کو فرمایا: آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نے رقم ادا کر دی ہے؟ تو انہوں نے عرض کی کہ میں تو اس سے بھی بڑی باتوں میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں، آپ جو آسمان سے آئی ہوئی باتیں بتاتے ہیں میں ان کی بھی تصدیق کرتا ہوں۔ اس پر حضور علیہ السلام نے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دیا۔

فائدہ: اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم معصوم نہ ہوتے تو حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ اتنے بڑے دعویٰ کی کبھی بھی تصدیق نہ کرتے۔

دلیل نمبر10:

- قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ (ت544ھ) فرماتے ہیں:

اَلْاِجْمَاعُ عَلَی الْعِصْمَۃِ عَنِ الْکَبَائِرِ بِلَا قَیْدٍ عَمْدًا وَسَھْوًا.

(النبراس شرح شرح العقائد: ص283)

ترجمہ: انبیاء علیہم السلام کبیرہ گناہوں سے پاک ہوتے ہیں، نہ عمداً کرتے ہیں نہ سہواً، اسی پر اجماع ہے۔

- ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ (ت1014ھ) فرماتے ہیں:

اِجْمَاعُ الصَّحَابَۃِ رَضِیَ اللہُ عَنْھُمْ عَلَی التَّاَسِّیْ بِہٖ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اَقْوَالِہٖ وَاَفْعَالِہٖ وَسَائِرِ اَحْوَالِہٖ حَتّٰی فِیْ کُلِّ حَالَاتِہٖ مِنْ غَیْرِ بَحْثٍ وَلَا تَفَکُّرٍ بَلْ بِمُجَرَّدِ عِلْمِھِمْ اَوْ ظَنِّھِمْ بِصُدُوْرِ ذٰلِکَ عَنْہُ دَلِیْلٌ قَاطِعٌ عَلٰی اِجْمَاعِھِمْ عَلٰی عِصْمَتِہٖ وَتَنَزُّھِہٖ عَنْ اَنْ یَّجْرِیَ عَلٰی ظَاھِرِہٖ اَوْ بَاطِنِہٖ شَئٌ لَا یُتَاَسّٰی بِہٖ فِیْہِ مِمَّا لَمْ یَقُمْ دَلِیْلٌ عَلَی اخْتِصَاصِہٖ.

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح: ج1 ص220)

ترجمہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تمام احوال میں بغیر کسی بحث و تفکر کے محض یہ جانتے ہوئے کہ یہ عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے آپ کی اتباع پر متفق ہو جانا واضح دلیل ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپ کی عصمت پر اجماع ہے اور اس پر بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہراً و باطناً ایسی کوئی چیز صادر نہیں ہو سکتی جس کی اتباع نہ کی جا سکتی ہو جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت پر کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے۔

فائدہ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کی مثالیں یہ ہیں:

1: کوئی مؤمن عورت اگر بغیر مہر کے خود کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نکاح کے لیے پیش کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے نکاح کرنا چاہیں تو نکاح ہو سکتا ہے جبکہ امتی کے نکاح میں مہر ادا کرنا شرط ہے۔

﴿وَامْرَاَۃً مُّؤْمِنَۃً اِنْ وَّھَبَتْ نَفْسَھَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْکِحَھَا خَالِصَۃً لَّکَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾

(سورۃ الاحزاب: 50)

ترجمہ: کوئی مسلمان عورت جس نے مہر کے بغیر نبی کو اپنے آپ سے نکاح کرنے کے لیے پیش کیا ہو بشرطیکہ نبی اس سے نکاح کرنا چاہے۔ یہ صرف آپ کے لیے ہے، آپ کے علاوہ باقی ایمان والوں کے لیے یہ جائز نہیں۔

2: اگر ایک سے زائد نکاح کی صورت میں امتی کے ذمہ باری مقرر کرنا واجب ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب نہیں ہے۔

﴿تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْھُنَّ وَتُـْٔوِیْٓ اِلَیْکَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکَ﴾

(سورۃ الاحزاب: 51)

ترجمہ: ان بیویوں میں سے آپ جس کی باری چاہیں ملتوی فرما دیں اور جس کو چاہیں اپنے پاس رکھیں اور جن کو آپ نے الگ کر دیا ہو ان میں سے اگر کسی کو واپس بلانا چاہیں تو اس میں بھی آپ کے لیے کوئی گناہ نہیں ہے۔

3: امتی کے لیے بیک وقت چار سے زائد نکاح کرنا جائز نہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جائز ہیں۔

- مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ (ت1396ھ) فرماتے ہیں:

”تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے۔ ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے محفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیرہ گناہ ان سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں۔“

(معارف القرآن: ج1 ص195 وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ سورۃ البقرۃ:35)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

”انبیاء علیہم السلام کا گناہوں سے معصوم ہونا تو ایک مسلمہ عقیدہ ہے جس پر تمام امت کا اجماع ہے۔“

(معارف القرآن: ج4 ص750)

فائدہ 1: شیخ محمد اعلیٰ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (ت1191ھ) نے اجماع امت کی یوں تعریف کی ہے:

هُوَ اتِّفَاقُ الْمُجْتَهِدِيْنَ مِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ عَصْرٍ عَلٰى حُكْمٍ شَرْعِيٍّ.

(کشاف اصطلاحات الفنون للتھانوی: ج1 ص238)

ترجمہ: اجماع امت سے مراد امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجتہدین کا کسی زمانہ میں کسی بھی حکم شرعی پر اتفاق کر لینا ہے۔

فائدہ 2:

اجماع کبھی کل ہوتا ہے اور کبھی اکثری۔

اجماع کلی سے مراد یہ ہے کہ تمام مجتہدین ایک مسئلہ پر متفق ہوں۔ اجماع اکثری سے مراد یہ ہے کہ اکثر فقہاء کسی مسئلہ پر متفق ہوں تب بھی اسے اجماع کہیں گے۔

علامہ ابو محمد محمود بن احمد العینی الحنفی (ت855ھ) صاحبِ ہدایہ امام ابو الحسن علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل المرغینانی (ت593ھ) کے ایک قول کی شرح میں فرماتے ہیں:

قَالَ صَاحِبُ الْهِدَايَةِ مِنْ أَصْحَابِنَا: "وَعَلٰى تَرْكِ الْقِرَاءَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ إِجْمَاعُ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ" فَسَمَّاهُ إِجْمَاعاً بِاعْتِبَارِ اتِّفَاقِ الْأَكْثَرِ وَمِثْلُ هٰذَا يُسَمّٰى إِجْمَاعاً عِنْدَنَا.

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری للعینی ج4 ص449 باب وجوب القراءۃ)

ترجمہ: ہمارے احناف میں سے صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں کہ ”امام کے پیچھے قراءت نہ کرنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے“ صاحبِ ہدایہ نے اکثر کے اتفاق کو ”اجماع“ فرمادیا ہے۔ اس طرح کا اکثری اتفاق ہمارے ہاں اجماع شمار ہوتا ہے۔

فائدہ 3: خلاف، شاذ، فرقہ باطلہ:

خلاف:

ایک مسئلہ پر اہل حق کے 100 افراد متفق ہیں، اب ان کے مقابلے میں نئی رائے پیش کرنا ”خلاف“ کہلاتا ہے۔ جیسے عقیدہ ختم نبوت کا انکار، حیات

عیسی علیہ السلام کا انکار وغیرہ۔

شاذ:

ایک مسئلہ پر اہلِ حق کے 99 افراد متفق ہیں اور اس مسئلہ میں اہلِ حق کا ایک فرد اختلاف کرتا ہے تو ان میں 99 کو سواد اعظم اور ایک کو "شاذ" کہتے ہیں۔ جیسے حافظ ابن تیمیہ کا تین طلاقوں کو ایک کہنا، بعض اہل علم کا آٹھ رکعات تراویح کا قول کرنا۔ شاذ رائے کو گمراہ تو نہیں کہیں گے کیونکہ یہ اہلِ حق کے فرد کی رائے ہے اسے تفرد کہیں لیکن اتباع شاذ کی نہیں بلکہ سواد اعظم کی کریں گے کیونکہ حدیث مبارک میں سواد اعظم کی اتباع ہی کا حکم دیا گیا ہے۔

"خلاف" کو رد کرتے ہیں اور اگر چیز ضروریات دین میں سے ہو تو مخالفت کی صورت میں فتوی بھی دیتے ہیں۔

"شاذ" پر عمل نہیں کرتے اور نہ ہی اس کے خلاف فتویٰ بازی کرتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب "شاذ" قرآن و سنت سے بالکل متصادم نہ ہو۔ اگر شاذ قول قرآن وسنت سے بالکل متصادم ہو تو پھر اس کو دلائل کے ساتھ رد کیا جائے گا۔

فرقہ باطلہ:

اجماعِ کلی کے مقابلے میں ایک مسئلہ نہیں بلکہ پورا مسلک بن کر آجائے تو یہ "فرقہ باطلہ" ہے۔

جیسے قرآن کو مان کر حدیث کا انکار کر دینا، قرآن و حدیث مان کر صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین کا انکار کرنا، قرآن و حدیث مان کر فقہ، اجتہاد کا انکار کرنا، وغیرہ

"فرقہ باطلہ" کا دلائل کے ساتھ رد بھی کرنا چاہیے اور اس کے خلاف فتویٰ بھی دینا چاہیے۔

فائدہ 3:

اوپر جو حوالے دئے گئے ان میں اجماع کلی کا تذکرہ تھا بعض حضرات نے اس پہ اجماع اکثری نقل کیا ہے۔

- امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی (ت 671ھ) لکھتے ہیں:

ذَهَبَ الْجُمْهُوْرُ فِيْ أَنَّ جَمِيْعَ الْأَنْبِيَاءِ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِمْ مَعْصُوْمُوْنَ عَنِ الْخَطَأِ وَالْغَلَطِ فِيْ اجْتِهَادِهِمْ.

(الجامع لاحکام القرآن: ج2 ص2058 تحت سورۃ الانبیاء آیت فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ الآیۃ (سورہ الانبیاء: 79))

ترجمہ: جمہور حضرات کا موقف یہ ہے کہ تمام انبیاء صلوات اللہ علیہم اپنے اجتہاد میں خطاء اور غلطی سے معصوم ہوتے ہیں۔

فائدہ:

یہاں "خطا" کا معنی یہ ہے ایسا اجتہاد ہو کہ اس کے مقابلے میں نص موجود نہ ہو، اور "غلطی" کا معنی یہ ہے کہ ایسا اجتہاد ہو کہ اس کے مقابلے میں نص موجود ہو۔ انبیاء علیہم السلام "غلطی" سے تو محفوظ ہیں ہی اور "خطا" سے بھی محفوظ ہوتے ہیں کیونکہ اگر "خطا" ہو بھی جائے تو وحی کے ذریعے انہیں بتا دیا جاتا ہے اور پیغمبر اس پر برقرار نہیں رہتے۔

- علامہ عبد العزیز پرہاڑوی رحمہ اللہ (ت 1239ھ) فرماتے ہیں:

قَالَ الْقَاضِيْ عِيَاضٌ: ذَهَبَ طَائِفَةٌ مِنْ مُحَقِّقِي الْفُقَهَاءِ وَالْمُتَكَلِّمِيْنَ إِلَى الْعِصْمَةِ عَنِ الصَّغَائِرِ كَالْعِصْمَةِ فِي الْكَبَائِرِ.

(النبراس: ص283)

ترجمہ: قاضی عیاض مالکی فرماتے ہیں کہ محقق فقہاء و متکلمین کا موقف یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس طرح کبیرہ گناہوں سے معصوم ہیں اسی طرح صغیرہ گناہوں سے بھی معصوم ہیں۔

تنبیہ:

جمہور حضرات کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کبائر کی طرح صغائر سے بھی پاک ہوتے ہیں البتہ بعض حضرات کا یہ جو موقف یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے صغائر کا صدور ممکن ہے۔ اس بارے میں وضاحت یہ ہے کہ...

- جمہور کے مقابلے میں ان بعض حضرات کا قول قابلِ اعتبار نہیں
- صغائر کی تعریف میں اختلاف ہے۔ انبیاء علیہم السلام سے سہواً یا خلافِ اولیٰ امور کا صادر ہونا جمہور کے نزدیک "صغائر" میں داخل ہی نہیں اس لیے جمہور حضرات؛ انبیاء علیہم السلام سے صغائر کے صدور کے قائل نہیں اور بعض حضرات کے نزدیک یہ امور صغائر میں داخل ہیں اس لیے ان کے ہاں انبیاء علیہم السلام سے صغائر کا صدور ممکن ہے۔ نتیجۃً یہ ہوا کہ یہ اختلاف نزاعِ لفظی ہے، نزاعِ حقیقی نہیں۔

عصمت انبیاء علیھم السلام اور امام اعظم امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الکوفی (ت150ھ):

وَالْأَنْبِيَاءُ عَلَيْهِمُ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ كُلُّهُمْ مُنَزَّهُوْنَ عَنِ الصَّغَائِرِ وَالْكَبَائِرِ وَالْكُفْرِ وَالْقَبَائِحِ.

(الفقہ الاکبر: ص3)

ترجمہ: سارے انبیاء علیہم السلام صغیرہ، کبیرہ گناہوں اور کفر اور بے ہودہ کاموں سے پاک ہوتے ہیں۔

فائدہ:

<u>کفر:</u> ضروریات دین میں سے کسی ایک امرِ ضروری کا انکار کرنا۔

مثال: اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار کرنا، اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کرنا، ختمِ نبوت کا انکار کرنا، خلافت و صحابیتِ صدیق رضی اللہ عنہ کا انکار کرنا، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنا وغیرہ

<u>کبیرہ گناہ:</u> جس گناہ پر قرآن کریم یا حدیث مبارک میں آگ اور جہنم کی وعید صراحت کے ساتھ آئی ہو یا اس کے مرتکب پر لعنت کی گئی ہو۔

مثال: جان بوجھ کر کسی کو قتل کرنا، زنا کرنا، چوری کرنا، بہتان لگانا وغیرہ

<u>صغیرہ گناہ:</u> جس گناہ پر ایسی وعید نہ ہو جو کبیرہ گناہ پر آئی ہے۔

مثال: وہ جھوٹ بولنا جس میں کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے، کسی فاسق کے پاس اٹھنا بیٹھنا وغیرہ۔

<u>قبائح:</u> ایسا قول و عمل جو نافرمانی تو نہ ہو البتہ عام ماحول اور معاشرے میں اس کا ذکر کرنا ناپسندیدہ ہو۔

مثال: خاوند بیوی کے پاس جائے اور لذت حاصل کرے تو یہ عبادت ہے لیکن یہ کام ایسا نہیں کہ جس کو کھلے عام بیان کیا جائے کہ میں آج گھر والوں کے پاس گیا تھا اور مجھے یوں مزہ آیا۔ یہ تذکرہ کرنا قبیح ہے۔

دلیل نمبر 11:

انسان جسم اور روح سے بنا ہے، جسم مٹی سے بنا ہے تو اس کی غذا اور دوا بھی مٹی سے ہی ہے اور روح آسمان سے آتی ہے تو اس کی غذا بھی آسمان سے آتی ہے۔ جسم بیمار ہو تو اس کو طبیب چاہئے اور جسم کے طبیب کو ڈاکٹر کہتے ہیں، روح بیمار ہو تو اس کو بھی طبیب چاہیے اور اس کے طبیب کو نبی اور رسول کہتے ہیں اور یہ ضابطہ عقلی ہے کہ طبیب جس مرض کا معالج ہو خود اس کا اس مرض میں مبتلا ہونا یہ اس طبیب کا عیب ہے۔ روح کی بیماری گناہ ہے تو خود روح کے طبیب یعنی نبی کا گناہ میں مبتلا ہونا اس کا عیب ہے۔ اس لیے طبیب روحانی یعنی نبی کا اس عیب سے پاک ہونا ضروری ہے۔

تنقیحات متکلم اسلام

دلیل نمبر12:

حضرات انبیاء علیہم السلام اطاعت خدا کروانے میں انسانوں کے لئے مقتدا ہیں تو اگر خود خدا کے نافرمان ہوں تو لوگوں کو اطاعت کا کیا درس دیں گے؟

تنقیحات متکلم اسلام

دلیل نمبر13:

امام فخر الدین محمد بن عمر الرازی رحمۃ اللہ علیہ (ت604ھ) فرماتے ہیں:

أَنَّ الرَّسُوْلَ أَفْضَلُ مِنَ الْمَلَكِ فَوَجَبَ أَنْ لَا يَصْدُرَ الذَّنْبُ مِنَ الرَّسُوْلِ وَإِنَّمَا قُلْنَا إِنَّهُ أَفْضَلُ لِقَوْلِهِ تَعَالٰى: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾﴾ [سورۃ آل عمران: 33]، وَوَجْهُ الِاسْتِدْلَالِ بِهِ قَدْ تَقَدَّمَ فِيْ مَسْأَلَةِ فَضْلِ الْمَلَكِ عَلَى الْبَشَرِ وَإِنَّمَا قُلْنَا إِنَّهُ لَمَّا كَانَ كَذٰلِكَ وَجَبَ أَنْ لَا يَصْدُرَ الذَّنْبُ عَنِ الرَّسُوْلِ لِأَنَّهُ تَعَالٰى وَصَفَ الْمَلَائِكَةَ بِتَرْكِ الذَّنْبِ فَقَالَ: ﴿لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ﴾ [سورۃ الانبیاء:27]. وَقَالَ: ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۶﴾﴾ [سورۃ التحریم:6]، فَلَوْ صَدَرَتِ الْمَعْصِيَةُ عَنِ الرَّسُوْلِ لَامْتَنَعَ كَوْنُهُ أَفْضَلَ مِنَ الْمَلَكِ لِقَوْلِهِ تَعَالٰى: ﴿اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾﴾ [سورۃ ص:28].

(التفسیر الکبیر للرازی: ج3 ص9 تحت تفسیر سورۃ البقرۃ. آیت: فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا الخ)

ترجمہ: رسول؛ فرشتے سے افضل ہے تو ضروری ہے کہ رسول سے گناہ صادر نہ ہو۔ یہ جو ہم نے کہا کہ رسول فرشتے سے افضل ہے اس کی دلیل اللہ کا یہ فرمان ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾﴾ [سورۃ آل عمران: 33] کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں سے پسند کیا۔ وجہ استدلال ماقبل میں انسان کی فرشتے پر افضلیت کے بیان میں گزر چکی ہے۔ اور یہ جو ہم نے بات کی کہ جب رسول فرشتے سے افضل ہے تو ضروری ہے کہ رسول سے گناہ سرزد نہ ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ گناہ نہیں کرتے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ﴾ [سورۃ الانبیاء:27] کہ فرشتے اللہ کے حضور بڑھ کر کوئی بات نہیں کرتے۔ نیز ارشاد باری ہے: ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۶﴾﴾ [سورۃ التحریم:6] کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی نہیں کرتے بلکہ جو انہیں حکم ہو وہی کرتے ہیں۔ تو اگر رسول سے گناہ سرزد ہوتا تو رسول فرشتہ سے افضل شمار نہ ہوتا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾﴾ [سورۃ ص:28]

کہ کیا ہم ایمان لانے والے اور نیک عمل کرنے والے لوگوں کو ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو زمین میں فساد مچاتے ہیں یا یہ کہ ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں کے برابر کر دیں گے؟!

عقیدہ عصمت انبیاء علیہم السلام پہ اعتراضات کے جوابات

حضرت آدم علیہ السلام پر اعتراضات کے جوابات

اعتراض نمبر 1:

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی بیوی کو جنت میں داخل فرمایا اور ساتھ ہی فرمایا:

﴿يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٥﴾﴾

(سورۃ البقرۃ:35)

ترجمہ: اے آدم! آپ اور آپ کی بیوی دونوں جنت میں رہو اور جو چاہو جہاں سے دل چاہو کھاؤ لیکن اس خاص درخت کے قریب مت جانا اگر اس درخت سے کھالیا تو تمہارا اپنا نقصان ہو گا۔

لیکن آدم علیہ السلام نے درخت کھالیا:

﴿فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ﴾

(سورۃ طٰہٰ:121)

ترجمہ: ان دونوں (حضرت آدم و حضرت حواء علیہا السلام) نے اس درخت میں سے کچھ کھالیا تو ان کا ستر کھل گیا اور وہ جنت کے پتوں سے اپنا ستر ڈھانکنے لگے۔

تو حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کا حکم نہیں مانا جو کہ معصیت ہے۔

جواب نمبر 1:

حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے تھے۔

﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٥﴾﴾.

(سورۃ طٰہٰ:115)

ترجمہ: ہم نے اس سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو ایک بات کی تاکید کی تھی، ان سے بھول ہو گئی، ہم نے ان میں عزم نہیں پایا۔

اور بھولنا معصیت نہیں ہوتا۔

عَنْ ثَوْبَانَ قَال قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلىَّ اللهُ عليَه وسلَّم رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ

كنز العمال رقم الحديث 10307

ترجمہ: حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کی خطاء، بھول اور جس پہ اسے مجبور کیا جائے۔ معاف کر دیا گیا ہے۔

سوال:

اگر بھول معاف ہے تو اس پہ حضرت آدم علیہ السلام کو ڈانٹ کیوں پڑی؟ اتنا عرصہ روتے کیوں رہے؟ معافی کس بات پہ مانگی؟

جواب نمبر 1:

نبی اور امتی کے بھولنے میں فرق ہے۔ نبی کا بھولنا ایسے ہے جیسے نمازی کا بھولنا اور امتی کا بھولنا ایسے ہے جیسے روزہ دار کا بھولنا۔

وضاحت: روزہ دار بھول جائے اور کھا پی لے تو گناہ بھی نہیں اور ڈانٹ بھی نہیں۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا نَسِيَ فَأَكَلَ وَشَرِبَ فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ فَإِنَّمَا أَطْعَمَهُ اللَّهُ وَسَقَاهُ

صحیح البخاری بَابُ الصَّائِمِ إِذَا أَكَلَ أَوْ شَرِبَ نَاسِيًا

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب روزہ دار بھول کر کوئی چیز کھالے یا کوئی چیز پی لے تو وہ اپنا روزہ پورا کرے۔ کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا ہے۔

اور اگر نمازی بھول جائے گناہ تو نہیں ڈانٹ ہوتی ہے کہ نماز دوبارہ پڑھو۔

فخر الدين عثمان بن علي الزيلعي الحنفي رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

يُفْسِدُ الصَّلَاةَ التَّكَلُّمُ ۔۔۔ عَامِدًا كان أو نَاسِيًا

تبیین الحقائق باب مایفسد الصلاۃ وما یکرہ فیھا

ترجمہ: نماز میں جان بوجھ کر یا بھول کر بولنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

نمازی کے ذمہ ایک کام ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے رازونیاز کی باتیں کرنا، اگر وہ بھی بھول جائے تو گناہ نہیں البتہ ڈانٹ ہے اور روزہ دار کے ذمہ کئی کام ہیں، وہ ایک بھول جائے تو گناہ بھی نہیں اور ڈانٹ بھی نہیں۔

اسی طرح نبی کے ذمہ ایک ہی کام ہے تعلق مع اللہ اور دین کی بات اس میں بھی بھول ہو جائے تو یہ گناہ تو نہیں البتہ ڈانٹ ہوتی ہے۔ امتی کے ذمہ چونکہ کئی کام ہوتے ہیں وہ اگر ایک بھول بھی جائے تو ڈانٹ نہیں ہوتی۔

مثال: کسی بچے کو دکان پر بھیجیں اور کئی کام اس کے ذمہ لگا دیں کہ ادرک، لہسن، دھنیا، پیاز، ہری مرچ، پودینہ لے آؤ۔ پھر وہ ایک چیز بھول جائے تو ڈانٹ نہیں پڑتی اور اگر ایک ہی چیز ادرک ذمہ ہو اور وہ بھی بھول جائے تو ڈانٹ ہے۔

تو نبی کا بھولنا ایسے جیسے نمازی بھول جائے اور امتی کا بھولنا ایسے جیسے روزہ دار بھول جائے۔

جواب نمبر 2:

نمازی کا بھولنا ایسے ہے جیسے حالت مشاہدہ والے کا بھولنا اور روزہ دار کا بھولنا ایسے جیسے حالت غیبوبت والے کا بھولنا۔ نبی چونکہ حالت مشاہدہ میں ہوتا ہے اس لئے بھول پہ ڈانٹ ہوتی ہے امتی حالت غیبوبت میں رہتا ہے اس لئے بھول پہ ڈانٹ نہیں ہوتی۔

اعتراض نمبر 1 کا جواب نمبر 2:

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾﴾

(سورۃ البقرۃ:36)

ترجمہ: پھر شیطان نے ان دونوں کو وہاں سے پھسلایا اور ڈگمگا دیا اور جس (عیش) میں وہ تھے اس سے انہیں نکال کر رہا اور ہم نے (آدم، ان کی بیوی اور شیطان سے) کہا: اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم {تمہاری اولاد} ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے ایک مدت تک زمین میں ٹھہرنا اور کسی قدر نفع اٹھانا طے کر دیا گیا ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اس آیت کے تحت "فائدہ" کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں:

یعنی ایک سزا تو تو ظاہری ہوئی کہ یہاں سے زمین پر جاؤ اور دوسری سزائے باطنی ہے کہ بعضوں میں باہمی عداوتیں بھی قائم رہیں گی جس سے لطف زندگی بہت کچھ کم ہو جائے گا۔ اگر شیطان اس وقت زمین پر نہیں آیا ہے جیسا کسی نوکر کو نوکری سے برطرف کر دیا جائے مگر جو کریم آقا ہوتے ہیں

اس کا بوریہ بستر فوار ہی نہیں پھینکوادیا کرتے بتدریج نکال دیتے ہیں تب تو اس خطاب میں وہ بھی داخل ہے اور آدم وحوا کو خطاب کا شامل ہونا ظاہر ہی ہے اور اگر زمین پر آچکا ہے تو یہ خطاب آدم وحوا کو مع ان کی اولاد کے ہے چونکہ اولاد ہونے والی تھی ہی اس لئے آدم وحوا کو سنانا منظور ہے کہ تمہاری اولاد میں بھی احیاناً باہم عداوت ہوگی چونکہ اولاد کی نااتفاقی سے والدین کو کو ضرور ہی صدمہ پہنچتا ہے اس لیے لیے ان کو یہ بات سنانا مقتضی حالت موجودہ کا تھا۔

بیان القرآن ج1ص244

اور "زَلَّۃٌ" اس غلطی کو کہا جاتا ہے جو بغیر قصد وارادہ کے ہو۔

امام ابو القاسم حسین بن محمد المعروف راغب اصفہانی (ت 502ھ) لکھتے ہیں:

اَلزَّلَّةُ فِي الْأَصْلِ: اسْتِرْسَالُ الرَّجُلِ مِنْ غَيْرِ قَصْدٍ.

(المفردات فی غریب القرآن: ص214)

ترجمہ: "زلۃ" کا لغت میں معنی ہے آدمی کا بغیر قصد وارادہ کے پھسل جانا۔

پھر زَلّۃ کی دو قسمیں ہیں: ۱: زَلّۃ فی الارادۃ ۲: زَلّۃ فی الفعل

زَلّۃ فی الارادۃ: سمجھنے میں غلطی لگ جائے۔

زَلّۃ فی الفعل: کام کرنے میں غلطی لگ جائے۔

یہاں زَلّۃ سے مراد "زَلّۃ فی الارادۃ" ہے۔ جب اللہ نے درخت سے منع کیا تو آدم علیہ السلام سمجھے کہ مجھے کسی خاص درخت سے منع کیا گیا ہے، لہذا آپ نے اس خاص درخت کو چھوڑ کر کسی دوسرے درخت سے کھالیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خاص درخت سے منع نہیں کیا تھا بلکہ درخت عام تھا یعنی جنسِ درخت سے منع کیا تھا۔ یوں آپ علیہ السلام سے زَلّۃ فی الارادۃ ہوگئی۔ معصیت اس نافرمانی کو کہتے ہیں جو بلا عذر اور جان بوجھ کر ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ فعل جان بوجھ کر نہیں صادر ہوا بلکہ ارادہ میں خطا ہوگئی اس لیے یہ نافرمانی نہیں ہے۔

اعتراض نمبر2:

اگر حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے تھے اور گناہ نہیں تھا تو دوسری آیت میں اسے عصیان کیوں فرمایا؟

﴿وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾﴾

(سورۃ طٰہٰ: 121)

ترجمہ: اور آدم نے اپنے رب کا حکم ٹالا اور راہ کھو بیٹھے۔

یہاں تو بھولنے کا تذکرہ نہیں معصیت کا ہے۔

جواب:

یہاں دو لفظ ہیں: (1) عصٰی (2) غوٰی

[۱]: جہاں تک لفظ "عصیٰ" کا تعلق ہے تو "عصیٰ" عصیان سے ہے۔ جس کا معنی ہمیشہ نافرمانی نہیں ہوتا بلکہ لغتِ عرب میں کبھی کبھی "عصٰی" کا اطلاق بھول چوک اور لغزش پر بھی مجازاً کر دیا جاتا ہے۔

ھدایۃ الساری الی دراسۃ البخاری میں ہے:

اَلْمَعْصِيَةُ مَصْدَرٌ وَقَدْ تُطْلَقُ عَلَى الزَّلَّةِ مَجَازًا.

(ھدایۃ الساری الی دراسۃ البخاری للعلامۃ امداد الحق السلھتی البنغلادیشی: ج1 ص107)

تو "عَصٰی" کا معنی ہے کہ بغیر ارادہ کے وہ کام کیا جائے جو ان کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس پہ قرینہ قرآن کریم کی یہ آیت ہے

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾﴾

(سورۃ البقرۃ:36)

ترجمہ: پھر شیطان نے ان دونوں کو وہاں سے پھسلایا اور ڈگمگا دیا اور جس (عیش) میں وہ تھے اس سے انہیں نکال کر رہا اور ہم نے (آدم، ان کی بیوی اور شیطان سے) کہا: اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم {تمہاری اولاد} ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے ایک مدت تک زمین میں ٹھہرنا اور کسی قدر نفع اٹھانا طے کر دیا گیا ہے۔

[۲]: "غَوٰی" "غَوَایَۃٌ" سے ہے۔ "غَوَایَۃٌ" کا معنی ہمیشہ گمراہ ہونا نہیں ہوتا بلکہ اس کا معنی عیش کا خراب ہونا اور زندگی کا تلخ ہونا بھی آتا ہے۔

امام ابو القاسم حسین بن محمد المعروف راغب اصفہانی (ت 502ھ) لکھتے ہیں:

وَقِيْلَ: مَعْنٰى "غَوٰى" فَسَدَ عَيْشُهُ، مِنْ قَوْلِهِمْ: غَوِيَ الْفَصِيْلُ وَغَوٰى نَحْوُ هَوِيَ وَهَوٰى.

(المفردات فی غریب القرآن: ص384)

ترجمہ: کہا گیا ہے کہ "غَوٰی" کا معنی زندگی کا خراب ہو جانا ہے۔ یہ عرب کے قول: "غَوِيَ الْفَصِيْلُ" سے بنا ہے جیسے لفظ "هَوِيَ وَهَوٰى" ہے (یعنی باب سمع سے ہے)

"غَوِيَ الْفَصِيْلُ" عرب کا محاورہ ہے جس کا معنی ہے: اونٹ کے بچے کی زندگی اجیرن ہو گئی اور مشکل میں پڑ گئی۔ یہ محاورہ اس وقت بولتے ہیں جب اونٹ کا بچہ دودھ زیادہ پینے کی وجہ سے بد ہضمی کا شکار ہو جائے اور اکتا جائے۔ نیز "غَوِيَ الْفَصِيْلُ" کا محاورہ اس وقت بھی بولتے ہیں جب وہ دودھ نہ ملنے کی وجہ سے بھوک سے نڈھال ہو جائے اور موت کی انتظار میں پڑ جائے۔

یہاں اس آیت میں بھی "غَوٰی" کا معنی "گمراہ ہونا" نہیں بلکہ دوسرا معنی مراد ہے یعنی عیش کا خراب ہونا۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے وہ کام ہو گیا جس سے جنت کی عیش جاتی رہی اور دنیا میں زندگی تلخ ہو گئی کہ مشکلات پیش آئیں۔

اس پہ قرینہ قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔

فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى

سورۃ طٰہٰ آیت 117

ترجمہ: ہم نے حضرت آدم سے کہا کہ شیطان تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے خیال کرنا کہیں یہ تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے اگر ایسا ہوا تو آپ مشقت میں پڑ جائیں گے۔

وہ مشقت یہ ہے کہ جنت میں کمانے کی ضرورت نہیں دنیا میں کمانا پڑے گا، جنت میں سردی گرمی نہیں دنیا میں سردی گرمی کی مشقت برداشت کرنی پڑے گی۔

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی المالکی (ت 671ھ) اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾ أَيْ فَسَدَ عَيْشُهُ فِي الْجَنَّةِ. وَيُقَالُ: غَوِيَ الْفَصِيْلُ إِذَا لَمْ يَدِرَّ لَبَنُ أُمِّهِ.

(الجامع لاحکام القرآن:)

ترجمہ: "غَوٰی" کا معنی ہے کہ اس آدم علیہ السلام کی زندگی جنت میں تلخ ہوگئی۔ محاورۃً کہا جاتا ہے: "غَوِیَ الْفَصِیْلُ" کہ اونٹ کے بچے کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ یہ اس وقت کہتے ہیں جب اونٹنی کا دودھ زیادہ نہ ہو۔

اشکال: یہ تفسیر درست نہیں؛ کیونکہ قرآن مجید میں لفظ "غَوٰی" ہے جو کہ باب فتح سے ہے۔ اور جو محاورہ ہے "غَوِیَ الْفَصِیْلُ" وہ باب سمع سے ہے۔ تو تفسیر کیسے درست ہوگی؟

جواب: بنوطے کی لغت میں ناقص یائی کا ماقبل اگر مکسور ہو تو یہ اس یاء کو الف سے تبدیل کر کے ماقبل کے کسرہ کو فتحہ سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ "فَنِیَ" اور "بَقِیَ" کو یہ لوگ "فَنَا" اور "بَقَا" پڑھتے ہیں۔ یہاں بھی محاورہ "غَوِیَ الْفَصِیْلُ" ہے لیکن اس قاعدہ کے تحت اسے "غَوٰی" بھی پڑھا جا سکتا ہے جو قرآنی لفظ ﴿فَغَوٰی﴾ کے بالکل مطابق ہے۔ اب اس کا معنی زندگی کا تلخ ہو جانا درست بنتا ہے۔

اعتراض نمبر 3:

اگر یہ گناہ نہ تھا تو آدم علیہ السلام کے الفاظ کو قرآن میں یوں کیوں ذکر کیا گیا:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾﴾ (الاعراف: 23)

ترجمہ: ان دونوں (آدم اور ان کی بیوی) نے کہا: اے ہمارے رب! ہم دونوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والے لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔

جواب نمبر 1:

بعض کام جو کہ فی الواقع گناہ نہیں ہوتے لیکن نبی اس کو اپنے لیے لفظ "گناہ" یا اس کے مرادف الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نبی کے انہی الفاظ کو نقل فرما دیتے ہیں اور یوں فرما دیتے ہیں کہ جس کو تو گناہ سمجھتا ہے ہم نے اس کو بھی معاف فرما دیا۔ اس سے سننے اور پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ گناہ ہے حالانکہ یہ گناہ ہوتا نہیں۔ تو یہاں حضرت آدم اور حضرت حواء نے کہا ہے: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا﴾، اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: "ظَلَمْتُمَا" تم دونوں نے ظلم کیا ہے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

مثال: جیسے کوئی ذکی اور حساس بچہ استاذ کے کہنے پر استاذ کے گھر سے شیشے کے گلاس میں دودھ لائے اور ٹھوکر لگنے سے گلاس ٹوٹ جائے اور دودھ گر جائے اور یہ بچہ استاذ سے کہے کہ مجھے معاف کر دیں، مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ استاذ کہے: بیٹا! تم نے کون سا بوجھ کر کیا ہے۔ بچہ پھر بھی انہی الفاظ کو دہرائے جا رہا ہے تو استاذ اس بچے کی خوشی کی خاطر فرما دے کہ تمہاری غلطی نہیں مگر جس کو تم غلطی سمجھ رہے ہو میں نے اس کو بھی معاف کر دیا۔ اب اس سے کوئی اس بچے کو طعنہ دے کہ تم نے فلاں وقت میں یہ کام غلط کیا تھا اور اس کے غلط ہونے پہ دلیل یہ پیش کرے کہ تمہارے استاذ نے اس کو غلطی کہہ کر معاف کیا تھا۔

جواب نمبر 2:

"ظلم" کا معنی ہے: "وَضْعُ الشَّيْئِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ" اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

[1]: کبھی ظلم کا اطلاق شرک پر ہوتا ہے۔

﴿وَ اِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِہٖ وَ ہُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰہِ ؕؔ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾﴾

سورۃ لقمان:13

ترجمہ: اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

[2]: کبھی ظلم کا اطلاق گناہِ کبیرہ پر ہوتا ہے۔

﴿وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰہَ وَ اسۡتَغۡفَرَ لَہُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۶۴﴾﴾

(سورۃ النساء:64)

ترجمہ: اور جب ان لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، اگر یہ اس وقت تمہارے پاس آ کر اللہ سے مغفرت مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے تو یہ اللہ کو بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان پاتے۔

[3]: کبھی ظلم کا اطلاق ایسے کام پر بھی ہوتا ہے جو کر لیا جائے جبکہ اسے نہیں کرنا چاہیئے۔

ضَرۡبُ الۡمَثَلِ:

"مَنِ اسۡتَرۡعَی الذِّئۡبَ فَقَدۡ ظَلَمَ" جس نے بھیڑیئے سے رکھوالی کرائی تو اس نے ایسا کام کیا جو اسے نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

تو اس آیت ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا﴾ میں بھی ظلم کا معنی گناہ نہیں بلکہ ایسا کام کرنا مراد ہے جو نہیں کرنا چاہیے تھا۔

جواب نمبر 3:

حضرت آدم علیہ السلام نے جو کام کیا وہ گناہ نہیں تھا لیکن وہ پھر بھی معافی مانگ رہے ہیں کہ میری غلطی ہے یہ تو عصمت کی دلیل ہے نہ کی معصیت کی۔

مثال: ایک آدمی مسجد سے نکلا اور غلطی میں کسی اور کا جوتا پہن کر چلا گیا گھر جا کر معلوم ہوا کہ یہ جوتا تو میرا نہیں اب وہ واپس مسجد آتا ہے، دیکھتا ہے جس کا جوتا ہے وہ تلاش کر رہا ہے۔ یہ آدمی اس سے کہتا ہے: میری غلطی ہے آپ مجھے معاف کر دیں۔ اب یہ شخص معصیت کا مرتکب نہیں ہوا بلکہ غلطی سے ایک کام کر بیٹھا لیکن اس پہ معافی مانگنا یہ اس کے بڑے پن کی دلیل ہے۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کا بھول کو غلطی کہنا یہ ان کی عصمت وطہارت کی دلیل ہے۔

اعتراض نمبر 4:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

﴿ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ جَعَلَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا لِیَسۡكُنَ اِلَیۡہَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰہَا حَمَلَتۡ حَمۡلًا خَفِیۡفًا فَمَرَّتۡ بِہٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثۡقَلَتۡ دَّعَوَا اللّٰہَ رَبَّہُمَا لَئِنۡ اٰتَیۡتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیۡنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰہُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَہٗ شُرَكَآءَ فِیۡمَاۤ اٰتٰہُمَا ۚ فَتَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۹۰﴾﴾

(الاعراف:189، 190)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی بنائی تاکہ وہ اس کے پاس آکر تسکین حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو عورت امید سے ہوگئی جسے لے کر وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں (میاں بیوی) نے اللہ سے دعا کی کہ اگر آپ نے ہمیں تندرست اولاد دی تو ضرور بالضرور آپ کا شکر ادا کریں گے۔ لیکن جب اللہ نے ان کو ایک تندرست بچہ دے دیا تو ان دونوں

نے اللہ کی عطا کی ہوئی اس نعمت میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا شروع کر دیا حالانکہ اللہ کا ان لوگوں کی مشرکانہ باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء سلام اللہ علیہانے اولاد ملنے پر شرک کیا ہے۔

جواب:

اس آیت میں "نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ" سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور "زَوْجَهَا" سے مراد آپ کی بیوی حضرت حواء علیہا السلام ہیں۔ اس کے بعد جو "فَلَمَّا تَغَشّٰهَا" ہے اس میں "هُوَ" ضمیر کا مرجع آیت میں مذکور "نفس واحدة" نہیں بلکہ اس کا مفہوم یعنی "شوہر" مراد ہے اور "هَا" ضمیر کا مرجع بھی آیت میں مذکور "زوجها" نہیں بلکہ اس کا مفہوم یعنی "بیوی" مراد ہے۔ آگے جو الفاظ ہیں: "دَّعَوَا اللّٰهَ".... "رَبَّهُمَا".... "اٰتَيْتَنَا".... "لَّنَكُوْنَنَّ".... "اٰتٰهُمَا".... "جَعَلَا".... "اٰتٰهُمَا" ان سب سے مراد مطلق شوہر اور بیوی ہیں۔

ہماری اس بات کی صحت پر تین قرائن موجود ہیں:

قرینہ نمبر 1:

آیت کا سیاق وسباق دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہاں شوہر اور بیوی سے مراد مشرک شوہر اور بیوی ہیں، آدم وحواء علیہا السلام مراد نہیں۔

اس آیت سے پہلے والی آیات:

﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٢﴾﴾

﴿وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿١٨٣﴾﴾

﴿اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٨٤﴾﴾

﴿اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٥﴾﴾

﴿مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٨٦﴾﴾

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٧﴾﴾

سورۃ الاعراف آیت: 182 تا 187

ترجمہ: جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے ہم انہیں آہستہ آہستہ اس طرح پکڑیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ میں ان کو مہلت دیتا ہوں اور میری خفیہ تدبیر بڑی مضبوط ہے۔ کیا ان لوگوں نے یہ بات نہیں سوچی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جنون کا شائبہ بھی نہیں بلکہ آپ تو صاف صاف تنبیہ کرنے والے ہیں۔ کیا ان لوگوں نے آسمان وزمین کی سلطنت میں اور جو چیزیں اللہ تعالی نے پیدا فرمائی ہیں ان میں غور وفکر نہیں کیا اور یہ بھی نہیں سوچا کہ شاید ان کی موت کا وقت قریب ہو، اس کے بعد وہ کس بات پہ ایمان لائیں گے۔ جسے اللہ تعالی گمراہ فرمادیں اسے کوئی

ہدایت نہیں دے سکتا ایسے لوگوں کو اللہ پاک اس حالت میں چھوڑتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں قیامت کب آئے گی؟ آپ فرمادیں اس کا علم صرف میرے پروردگار کے پاس ہے صرف وہی اسے مقررہ وقت پہ لاکر دکھائے گا، قیامت آسمان وزمین میں ایک بھاری چیز ہے، جو تمہارے پاس اچانک آئے گی یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق ایسے پوچھتے ہیں جیسے آپ نے اس کی مکمل تحقیق کر رکھی ہو آپ فرمادیں اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مشرکین کے احوال کا بیان چل رہا ہے۔

اس کے بعد والی آیات:

﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿١٩٠﴾﴾

﴿اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿١٩١﴾﴾

﴿وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَاۤ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٢﴾﴾

﴿وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿١٩٣﴾﴾

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٩٤﴾﴾

سورۃ الاعراف آیت: 190 تا 194

ترجمہ: اللہ تعالی ان کی مشرکانہ باتوں سے بلند وبالا ہے۔ کیا وہ اللہ تعالی کے ساتھ خدائی میں ایسی چیزوں کو شریک مانتے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ خود ان کو پیدا کیا جاتا ہے؟ اور جو نہ اپنی مدد کرسکتے ہیں نہ ہی ان کی مدد کرسکتے ہیں۔ اگر تم انہیں سیدھے راستے کی طرف بلاو روہ تمہاری بات نہیں مانیں گے، تم انہیں پکارو یا خاموش رہو ان کے لئے دونوں باتیں برابر ہیں۔ اللہ تعالی کے علاوہ تم جن جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری طرح اللہ کی مخلوق ہیں اب ذرا ان سے کوئی چیز مانگو اگر تم سچے ہو تو انہیں تمہاری ضرورت پوری کرنی چاہیے۔

یہ سارے صیغے جمع کے ہیں اور ان میں شرک کا تذکرہ ہے۔ اگر مراد حضرت آدم وحواء علیہما السلام ہوتے تو صیغے تثنیہ کے ہوتے۔ جمع کے صیغے دلیل ہیں کہ مراد مشرکین ہیں۔

قرینہ نمبر 2:

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ شرک حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں نہیں تھا بلکہ یہ بعد میں حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں شروع ہوا تھا۔ جب آپ علیہ السلام کے دور میں شرک تھا ہی نہیں تو آپ کو مرتکبِ شرک قرار دینا کیسے درست ہوگا؟

قرینہ نمبر 3:

جو لوگ حضرت حضرت آدم علیہ السلام پر اعتراض کرتے ہیں وہ حضرت آدم علیہ السلام کو نبی مانتے ہیں البتہ عصمت پر اعتراض کرتے ہیں۔ اگر اس آیت میں شرک کا مرتکب حضرت آدم علیہ السلام کو قرار دیا جائے تو ان کا کافر ہونا لازم آئے گا- معاذ اللہ- حالانکہ منکرینِ عصمتِ انبیاء آپ علیہ السلام کو مسلمان مانتے ہیں۔ اس لیے اس آیت میں شرک کے ارتکاب کا مصداق حضرت آدم علیہ السلام کو قرار دینا درست نہیں ہے، اس کا مصداق مشرک لوگ ہیں۔

فائدہ:

یہ جو ہم نے جواب دیا ہے اس کی تائید مندرجہ ذیل تفاسیر سے بھی ہوتی ہے۔

1: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما:

وَأَخْرَجَ ابْنُ الْمُنْذِرِ وَابْنُ أَبِي حَاتِمٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: مَا أَشْرَكَ آدَمُ، أَنَّ أَوَّلَهُمَا شُكْرٌ وَآخِرَهُمَا مَثَلٌ ضَرَبَهُ لِمَنْ بَعْدَهُ.

(تفسیر الدر المنثور للسیوطی: ج6 ص705)

ترجمہ: حافظ ابن المنذر اور امام ابن ابی حاتم الرازی نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ تفسیر نقل کی ہے کہ آدم علیہ السلام نے شرک نہیں کیا کہ بلاشبہ ان دونوں آیت میں پہلا حصہ شکر پر مشتمل ہے (یعنی انسانوں کو اس بات پر شکر کرنے کی تعلیم دی ہے کہ انہیں آدم و حواء سے پیدا کیا گیا ہے) اور دوسرے حصے میں ایک مثال ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے بعد آنے والوں کے لئے بیان کیا۔

(یہاں "بعدہ" کہنے میں اشارہ ہے کہ اس مثال سے مراد آدم علیہ السلام کے علاوہ دیگر لوگ ہیں)

ضابطہ:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما صحابی ہیں اور صحابی کی تفسیر کے بارے میں ضابطہ ہے۔

امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الحاکم النیشابوری (ت 405ھ) لکھتے ہیں:

لِيَعْلَمَ طَالِبُ هٰذَا الْعِلْمِ أَنَّ تَفْسِيرَ الصَّحَابِيِّ الَّذِي شَهِدَ الْوَحْيَ وَالتَّنْزِيلَ عِنْدَ الشَّيْخَيْنِ حَدِيثٌ مُسْنَدٌ»

(المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ج2 ص283)

ترجمہ: علم حدیث کے طالب علم کو یہ بات جان لینی چاہیے کہ صحابی رسول جس نے نزولِ وحی کا زمانہ پایا ہو اس کا تفسیر کرنا امام بخاری و امام مسلم کے ہاں حدیث مسند کے حکم میں ہے۔

2: حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تابعی (ت 110ھ):

عَنِ الْحَسَنِ: ﴿جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا﴾ قَالَ: كَانَ هٰذَا فِي بَعْضِ أَهْلِ الْمِلَلِ، وَلَمْ يَكُنْ بِآدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ.

(تفسیر الطبری: ج13 ص314)

ترجمہ: حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ ﴿جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا﴾ سے مراد بعض دیگر اقوام ہیں، اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام نہیں ہیں۔

فائدہ:

مشرکین کا عام مزاج یہ ہے کہ عام حالات میں شرک کرتے رہتے ہیں اور جب مصیبت پڑتی ہے تو فوراً اللہ کی طرف رجوع کرنے لگ جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

1: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾

(سورۃ یونس: 22، 23)

ترجمہ: وہ اللہ ہی تو ہے جو تمہیں خشکی میں بھی اور سمندر میں بھی سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو، اور یہ کشتیاں لوگوں کو لے کر خوشگوار ہوا کے ساتھ پانی پر چلتی ہیں اور لوگ اس بات پر مگن ہوتے ہیں تو اچانک ان کے پاس ایک تیز آندھی آتی ہے اور ہر طرف سے ان پر موجیں اٹھتی ہیں اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ہر طرف سے گھر گئے۔ تو اس وقت وہ خلوص کے ساتھ صرف اللہ پر اعتقاد کر کے صرف اسی کو پکارتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) "(یا اللہ!) اگر تو نے ہمیں اس (مصیبت سے) نجات دے دی تو ہم ضرور بالضرور شکر گزار لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔" لیکن جب اللہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔

2: ﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ۝٦٥﴾

(سورۃ العنکبوت:65)

ترجمہ: چنانچہ جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو اس طرح پکارتے ہیں کہ ان کا اعتقاد خالص اسی پر ہوتا ہے۔ پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے ہیں۔

تو سورۃ الاعراف کی اس آیت نمبر 189 اور 190 میں بھی مشرکین کی حالت کو بیان کیا جا رہا ہے کہ جب مشرک کی بیوی حمل سے ہوتی ہے تو وہ دونوں میاں بیوی دعائیں کرتے ہیں کہ اے اللہ! اگر آپ نے ہمیں تندرست اولاد دی تو ضرور بالضرور آپ کا شکر ادا کریں گے لیکن جب اولاد ملتی ہے تو پھر شرک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تو اس آیت شرک کرنے کا تعلق حضرت آدم و حضرت حواء علیہا السلام کے ساتھ نہیں ہے۔

اشکال:

جب آیت کی ابتداء میں تذکرہ حضرت آدم و حضرت حواء علیہا السلام کا ہے، تو اس کے فوراً بعد مشرکین کا ذکر کیوں کیا ہے؟

جواب:

چونکہ اس آیت میں جو حکم دینا تھا وہ حضرت آدم اور حضرت حواء کو نہیں تھا بلکہ عمومی انسان کا مزاج بتانا تھا اس لئے مشرکین کا ذکر آیا۔

یہ ایسے ہے جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ ۖ﴾

(سورۃ الطلاق:1)

ترجمہ: اے نبی! جب آپ اپنی بیویوں کو طلاق دیں تو ایسے وقت میں دیں کہ عدت گزارنا ان کے لیے آسان ہو۔

یہاں اصل حکم تو دینا تھا امت کو لیکن خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ آپ امت کو یہ بات سمجھا دیں۔ یہاں بھی ایسے ہی ہے۔

اعتراض نمبر 5:

عَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا حَمَلَتْ حَوَّاءُ طَافَ بِهَا إِبْلِيسُ وَكَانَ لَا يَعِيشُ لَهَا وَلَدٌ فَقَالَ سَمِّيهِ عَبْدَ الْحَارِثِ فَسَمَّتْهُ عَبْدَ الْحَارِثِ فَعَاشَ وَكَانَ ذَلِكَ مِنْ وَحْيِ الشَّيْطَانِ وَأَمْرِهِ.

(سنن الترمذی: ابواب التفسیر. سورۃ الاعراف)

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب حضرت حواء امید سے ہوئیں تو ابلیس ان کے پاس چکر لگانے لگا۔ چونکہ آپ سلام اللہ علیھا کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی اس لیے ابلیس کہنے لگا کہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کا نام عبد الحارث رکھنا۔ (بچہ پیدا ہوا) تو حضرت حواء نے اس کا نام عبد الحارث رکھا۔ وہ بچہ زندہ رہا۔ یہ کام شیطان کے اکسانے اور کہنے سے ہوا۔

"حارث" شیطان کا نام ہے۔ تو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء سلام اللہ علیہا نے اپنے بیٹے کا نام "عبد الحارث" رکھ کے گویا شرک کا ارتکاب کیا جو شان نبوت سے بہت بعید ہے۔

جواب نمبر 1:

سنن الترمذی کی اس روایت کی سند یہ ہے:

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى حَدَّثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ بْنُ عَبْدِ الْوَارِثِ حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ عَنْ قَتَادَةَ عَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ الخ

اس میں ایک راوی ہے عمر بن ابراہیم جو قتادہ سے روایت کر رہا ہے اور اس روایت میں منفرد بھی ہے۔ اس راوی کی قتادہ سے نقل کردہ روایات پر سخت کلام ہے۔ محدثین کی آراء یہ ہیں:

◆ امام احمد بن حنبل: هُوَ يَرْوِيْ عَنْ قَتَادَةَ أَحَادِيْثَ مَنَاكِيْرَ يُخَالِفُ. (تہذیب التہذیب: ج4 ص691)

ترجمہ: یہ قتادہ سے منکر روایات نقل کرتا ہے جو عام روایات کے مخالف ہوتی ہیں۔

◆ امام ابو حاتم محمد بن ادریس الرازی: يُكْتَبُ حَدِيْثُهُ وَلَا يُحْتَجُّ بِهٖ. (الجرح والتعدیل: ج6 ص119)

ترجمہ: اس کی روایات لکھ تو لی جائیں لیکن انہیں دلیل نہ بنایا جائے۔

◆ امام محمد بن حبان: كَانَ مِمَّنْ يَنْفَرِدُ عَنْ قَتَادَةَ بِمَا لَا يُشْبِهُ حَدِيْثَهُ، فَلَا يُعْجِبُنِي الْاِحْتِجَاجُ بِهٖ إِذَا انْفَرَدَ. (المجروحین لابن حبان: ج2 ص89)

ترجمہ: یہ امام قتادہ سے ایسی روایات بیان کرنے میں منفرد ہے جو قتادہ کی عام روایات کے موافق نہیں ہوتیں۔ جب یہ منفرد ہو تو اس کی روایت کو دلیل بنانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

◆ حافظ عبد اللہ بن عدی: يَرْوِيْ عَنْ قَتَادَةَ أَشْيَاءَ لَا يُوَافِقُ عَلَيْهَا. (الکامل فی الضعفاء: ج6 ص86)

ترجمہ: قتادہ سے ایسی روایات نقل کرتا ہے جن کی موافقت نہیں ہوتی۔

◆ حافظ ابن حجر العسقلانی: صَدُوْقٌ، فِيْ حَدِيْثِهٖ عَنْ قَتَادَةَ ضُعْفٌ. (تقریب التہذیب: ص440)

ترجمہ: فی نفسہ سچا ہے لیکن اس کی قتادہ سے روایات میں ضعف ہوتا ہے۔

قتادہ سے منفرد ہونے کی وجہ سے عمر بن ابراہیم کی یہ روایت ضعیف ہے۔ لہذا اس روایت کو دلیل بنا کر نبی کی شانِ اقدس کے بارے میں کوئی نامناسب بات کرنا یا کوئی نازیبا نظریہ قائم کرنا بالکل جائز نہیں۔

جواب نمبر 2:

نیز یہ روایت واقع کے بھی خلاف ہے کیونکہ حضرت آدم و حواء علیہا السلام کے دنیا میں بھیجنے کا مقصد ان سے اولاد کا جاری ہونا تھا۔ ایک حمل سے ایک لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے رہے۔ اگر ان کی اولاد نہ ہوتی اور انہیں اولاد کے حصول کے لیے دعائیں کرنی پڑتیں کہ یا اللہ! اگر آپ نے ہمیں تندرست اولاد دی تو ضرور بالضرور آپ کا شکر ادا کریں گے الخ تو پھر ان کے دنیا میں بھیجنے کا قصد ہی فوت ہو جاتا۔ اس لیے یہ روایت ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ ناقابلِ واقعہ بھی ہے۔

جواب نمبر 3:

حضرت آدم علیہ السلام نبی ہیں، شرک کرنے سے انسان مسلمان ہی نہیں رہتا، شرک کرنے سے نبی کیسے ہو سکتا ہے؟

اشکال: اگر کوئی یہ کہے کہ قرآن کریم سے حضرت آدم علیہ السلام کا شرک کرنا ثابت ہو رہا ہے، شرک کیا تو نبی ہی نہ رہے لہٰذا ہم تو ان کو نبی ہی نہیں مانتے۔

جواب: جب آپ ان کو نبی ہی نہیں مانتے تو پھر یہ اشکال تو نہ ہوا کہ نبی معصوم نہیں ہوتا۔ یہ بحث تو اس وقت ہے جب کوئی شخص نبی مانے اور معصوم نہ مانے۔ اگر کوئی شخص نبی ہی نہ مانے اب اس سے عصمت پہ بحث نہیں ہو گی بلکہ اس بات پہ بحث ہو گی کہ حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے یا نہیں؟

خلاصۃ الکلام:

حضرت آدم علیہ السلام پہ شرک کا اعتراض کرنا نقل اور عقل کے خلاف ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام پر اعتراض کا جواب

اعتراض:

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا:

﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿٣٧﴾﴾

(سورۃ ھود:37)

ترجمہ: ہمارے حکم سے ہماری نگرانی وحفاظت میں آپ کشتی تیار کریں اور روانگی کے وقت مجھ سے ظالموں کے متعلق بات نہ کرنا! بے شک ظالم لوگ غرق کر دیے جائیں گے۔

اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کو ظالم لوگوں یعنی کفار کے متعلق سفارش کرنے سے روکا گیا تھا لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنے کافر بیٹے کے لئے سفارش کی اور یوں عرض کیا:

﴿رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ﴿٤٥﴾﴾

(سورۃ ھود:45)

ترجمہ: اے میرے رب! میرا بیٹا میرے گھر ہی کا ایک فرد ہے اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سرداروں کا بھی سردار ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں سفارش کرنے سے روکا تھا تو حضرت نوح علیہ السلام نے بیٹے کے متعلق سفارش کی جو کافر تھا تو یہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔

جواب:

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا:

﴿احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ ۚ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٤٠﴾﴾

(سورۃ ھود:40)

ترجمہ: اس کشتی میں ہر قسم کے جانوروں میں سے دو دو جانور یعنی نر اور مادہ سوار کریں اور تمہارے گھر والوں میں سے جس کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے (کہ وہ کفر کی وجہ سے غرق ہوں گے) ان کو چھوڑ کر باقی گھر والوں کو بھی اور جتنے لوگ ایمان لائے ہیں ان کو بھی (ساتھ لے لو) اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے۔

اس آیت میں حکم دیا کہ:

1: ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک جوڑا یعنی نر اور مادہ سوار کریں۔

2: اپنے اہل کو بھی سوار کرلیں۔

3: اپنے اہل کے علاوہ لوگوں میں سے جو مؤمن ہوں ان کو سوار کرلیں۔

تو سوار ہونے والوں میں ایک تو "أَهْلَكَ" آپ کے مؤمن رشتہ دار ہیں اور دوسرے "مَنْ آمَنَ" جو عام مؤمنین ہیں اور رشتہ دار نہیں ہیں۔ اس حکم سے آپ یہ سمجھے کہ بیٹا بھی تو اھل میں شامل ہے اس لیے بیٹا بھی اس طوفان سے بچے گا تو اس کو بھی کشتی میں سوار ہونے کی دعوت دی اور اس کے لیے اللہ سے عرض بھی کی کہ یہ تو میرا بیٹا ہے اس لیے میرے اہل میں شامل ہے اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میرے اہل کو بچائیں گے۔ آپ علیہ السلام کی توجہ ﴿إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ﴾ کی طرف نہ ہو سکی۔ اور اہل سے مطلق اہل سمجھے مومن ہو یا کافر۔

اب اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿یٰنُوۡحُ اِنَّہٗ لَیۡسَ مِنۡ اَہۡلِکَ ۚ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ ٭۫ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّیۡۤ اَعِظُکَ اَنۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۴۶﴾﴾

(سورۃ ہود:46)

ترجمہ: اللہ نے فرمایا: اے نوح! یقیناوہ تمہارے (اُن) گھر والوں میں سے نہیں (جو ہماری مراد ہیں) وہ تو ناپاک عمل کا پلندہ ہے، لہذا تم مجھ سے ایسی چیز نہ مانگو جس کی تمہیں خبر نہیں۔ میری تمہیں نصیحت ہے کہ ان لوگوں میں سے نہ ہونا جو بات کو نہیں سمجھتے۔

اللہ نے فرمایا: اے نوح! یہ جو ہم نے کہا تھا کہ "وَ اَہۡلَکَ" تو اس سے مراد وہ اہل ہے جو مؤمن ہو اور ﴿مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡہِ الۡقَوۡلُ﴾ میں شامل نہ ہو یعنی بوجہ کفر کے ان پر عذاب کا فیصلہ نہ آچکا ہو۔ اگر ایسا اہل ہوا تو ہم اسے بچائیں گے، اور یہ جو آپ کا بیٹا ہے ﴿اِنَّہٗ لَیۡسَ مِنۡ اَہۡلِکَ﴾ یہ اس اہل میں شامل نہیں ہے جو ہم نے کہا، کیونکہ ﴿اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ﴾ یہ تو کافر ہے اور ہم نے وہ اہل کہے تھے جو مؤمن ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ تنبیہ فرمائی۔

اب نوح علیہ السلام نے عرض کی:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِکَ اَنۡ اَسۡـَٔلَکَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغۡفِرۡ لِیۡ وَ تَرۡحَمۡنِیۡۤ اَکُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۴۷﴾﴾

(سورۃ ھود:47)

ترجمہ: نوح علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں نے آپ سے ایسی چیز مانگ لی جس میں میں آپ کی مراد معلوم نہ کرسکا۔ اور اگر آپ نے میری مغفرت نہ فرمائی اور مجھ پر رحم نہ کیا تو میں بھی نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو جاؤں گا۔

یہاں حضرت نوح علیہ السلام یہ فرمارہے ہیں: ﴿اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِکَ اَنۡ اَسۡـَٔلَکَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ﴾ کہ اے اللہ! میں یہ مانتا ہوں کہ میری توجہ اس طرف نہیں جاسکی، لہذا آپ مجھے معاف فرمادیں! اگر آپ نے کرم نہ کیا تو میری بڑا نقصان ہو جائے گا۔

اب یہ کام "گناہ" تو تب ہوتا جب آپ علیہ السلام یہ سمجھتے کہ اللہ کا حکم ہے کہ کافر کو سوار نہ کرو اور آپ کافر کو سوار کرلیتے! حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ تو یہ بالکل واضح ہے کہ کہ یہ گناہ نہیں۔ رہی تنبیہ تو وہ محض اس بات پر ہے کہ آپ کو یہ بات سمجھنی چاہیے تھی۔ کیونکہ آپ میرے مقرب ہیں۔

فائدہ:

عَنِ الشَّعْبِيِّ قَالَ خَطَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ فِي النَّاسِ فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ لَا تُغَالُوا فِي صُدُقِ النِّسَاءِ فَإِنَّهُ لَا يَبْلُغُنِي عَنْ أَحَدٍ سَاقَ أَكْثَرَ مِنْ شَيْءٍ سَاقَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ سِيقَ إِلَيْهِ إِلَّا جَعَلْتُ فَضْلَ ذَلِكَ فِي بَيْتِ الْمَالِ ثُمَّ نَزَلَ، فَعَرَضت لَهُ امْرَأَةٌ مِنْ قُرَيْشٍ فَقَالَتْ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ كِتَابُ اللهِ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَوْ قَوْلُكَ ؟ قَالَ: بَلْ كِتَابُ اللهِ، بِمَ ذَاكَ ؟ ". فَقَالَتْ: إِنَّكَ نَهَيْتَ النَّاسَ آنِفًا أَنْ يُغَالُوا فِي صُدُقِ النِّسَاءِ، وَاللهُ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ فِي كِتَابِهِ: {وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا، فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا فَقَالَ عُمَرُ: "كُلُّ أَحَدٍ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ ". مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا، ثُمَّ رَجَعَ إِلَى الْمِنْبَرِ، فَقَالَ لِلنَّاسِ: إِنِّي كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ أَنْ تُغَالُوا فِي صُدُقِ النِّسَاءِ، فَلْيَفْعَلْ رَجُلٌ فِي مَالِهِ مَا شَاءَ

شرح مشکل الآثار رقم الحدیث 5059

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار خطبہ دیا حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا لوگو حق مہر مقرر کرنے میں غلو سے کام نہ لو اگر مجھے کسی کے بارے معلوم ہوا کہ اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق مہر سے زیادہ حق مہر مقرر کیا تو وہ زائد بیت المال میں جمع کردیا جائے گا۔ آپ خطبہ دیکر

منبر سے نیچے اترے تو ایک قریشی عورت نے کہا: امیر المؤمنین ہم آپ کی بات مانیں یا قرآن کریم کی؟ آپ نے فرمایا: قرآن کریم کی۔ آپ نے پوچھا یہ سوال تم نے کیوں کیا؟ اس عورت نے کہا آپ نے ابھی زیادہ حق مہر مقرر کرنے سے منع فرمایا جبکہ اللہ تعالی فرماتے ہیں اگر تم عورتوں کو حق مہر میں سونے کا ڈھیر بھی دو تو پھر اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے {ازراہ تواضع} دو تین بار فرمایا: مدینہ کے توسب لوگ عمر سے زیادہ فقیہ ہیں آپ رضی اللہ عنہ دوبارہ منبر پہ تشریف لائے اور فرمایالوگو: میں نے تمہیں زیادہ حق مہر مقرر کرنے سے منع کیا تھا، اب اجازت دیتاہوں کہ انسان اپنے مال میں جو چاہے تصرف کرے۔

جس طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اس آیت کریمہ کی طرف توجہ نہیں گئی اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی توجہ بھی ”الا من سبق علیہ القول کی طرف“ نہیں گئی۔

سوال: حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں اللہ نے فرمایا: ﴿إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ کہ اس کے عمل درست نہیں حالانکہ عذاب تو کفر کی وجہ سے آرہاہے، بد عملی کی وجہ سے نہیں۔ تو بد عملی کو بنیاد بنا کر عذاب کا فیصلہ کیوں کیا گیا؟

جواب: اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ ”إِنَّ لَهُ عَمَلًا غَيْرَ صَالِحٍ“ یہ وہ شخص ہے جس کے عمل ٹھیک نہیں۔ بلکہ یہ فرمایا: ﴿إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ یعنی یہ ایسا شخص ہے جو سراپا بد عملی ہے۔ سراپا بد عملی وہ ہوتا ہے جس کا نیک عمل قبول ہی نہ ہو اور وہ کافر ہی ہو سکتا ہے۔ تو اس تعبیر کے اختیار کرنے سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں:

1: یہ کافر تھا۔

2: کافر کا کوئی عمل بھی قبول نہیں ہوتا۔

اگر یہ فرما دیا جاتا کہ ”إِنَّهُ كَافِرٌ“ تو اس کا کافر ہونا تو سمجھ میں آتا لیکن دوسری بات سمجھ میں نہ آتی کہ کافر کا کوئی بھی عمل قبول نہیں ہوتا۔ اس کے لئے پھر مستقل دلیل کی ضرورت پڑتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اعتراضات کے جوابات

اعتراض نمبر 1:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاند اور سورج اور ستاروں کو اپنا خدا فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿76﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿77﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿78﴾﴾

(سورۃ الانعام:76 تا78)

ترجمہ: چنانچہ جب ان پر رات چھائی تو انہوں نے ایک ستارا دیکھا، کہنے لگے: یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ ڈوب گیا تو انہوں نے کہا: میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر جب انہوں نے چاند کو چمکتے دیکھا تو کہا کہ یہ میرا رب ہے؟ لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہنے لگے: اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دے تو میں یقیناً گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔ پھر جب انہوں نے سورج وک چمکتے دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے؟ یہ زیادہ بڑا ہے۔ پھر جب وہ غروب ہوا تو انہوں نے کہا: اے میری قوم! جن جن چیزوں کو تم اللہ کی خدائی میں شریک قرار دیتے ہو میں ان سب سے بیزار ہوں۔

جواب:

جواب سمجھنے سے پہلے بطور تمہید کے ایک بات سمجھیں۔

استفہام (سوال کرنا) کی کئی قسمیں ہیں:

1: استفہام تقریری: اپنی بات کو مستحکم اور پختہ کرنے کے لئے بات کو سوالیہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

مثال 1: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ [الاعراف:172] کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟

مثال 2: خاوند اپنی بیوی سے کہے: کیا میں تمہارا شوہر نہیں ہوں، کیا میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا؟

استاذ اپنے شاگرد سے کہے: کیا میں تمہارا استاد نہیں ہوں، کیا میں تمہیں ڈانٹ نہیں سکتا؟

شیخ اپنے مرید سے کہے: کیا میں تمہارا مرشد نہیں ہوں، کیا مجھے یہ حق نہیں کہ میں تمہیں سمجھاؤں؟

2: استفہام انکاری: کسی غلط بات پہ ڈانٹنے کے لئے یا کسی بات کا انکار کرنے کے لئے سوال کرنا۔

مثال 1: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ [البقرۃ:28] تم اللہ کا کیسے انکار کرتے ہو؟

مثال 2: جب مہمان کے سامنے کھانا رکھیں جو اسے پسند نہ ہو اور وہ کہے: کیا میں یہ کھانا کھاؤں گا؟ مطلب یہ ہے کہ میں یہ نہیں کھا سکتا!

اب جواب یہ سمجھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں وغیرہ کے خدا ہونے کا اقرار نہیں کیا بلکہ اپنی قوم سے بطور استفہام انکاری کے فرمایا: ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾ کیا یہ ستارا میرا رب ہے؟ یعنی یہ میرا رب نہیں ہے۔ پھر ستارہ کے چھپنے کے بعد خود اس کا جواب دلیل کے ساتھ ارشاد فرمایا:

﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿76﴾﴾ (الانعام:76)

کہ جو ڈوب جائے، چھپ جائے میں کبھی اس سے محبت نہیں کرتا اسے خدا کیسے مان لوں گا؟

اور جب چاند کے متعلق سوال کیا تو اس کے چلے جانے کے بعد بھی خود ہی جواب دیا کہ:

﴿لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ﴾(الانعام:77)

کہ اگر میرا خدا مجھے ہدایت نہ دیتا تو میں بھی گمراہ ہو جاتا۔ اس کا معنیٰ یہ کہ آپ چاند کے معبود ہونے کے مقر نہیں بلکہ منکر تھے۔

اور جب سورج کے متعلق سوال کیا تو اس کے غروب ہونے کے بعد بھی خود ہی جواب دیا کہ:

﴿يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾

(الانعام:78،79)

کہ اے میری قوم! میں تمہارے شرک سے اعلان برات کرتا ہوں، میں تو یکسو ہو کر اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو آسمان وزمین کا خالق ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

فائدہ:

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ﴾ یہاں یہ نہیں فرمایا: "لَا اَعْبُدُ الْاٰفِلِيْنَ" کہ میں چھپ جانے والے کی عبادت نہیں کرتا بلکہ فرمایا کہ میں ان سے محبت نہیں کرتا۔ آپ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ میں تو ان سے محبت بھی نہیں کرتا عبادت تو بعد کی بات ہے!! معبود سے محبت بھی ہوتی ہے اور عقیدت بھی۔ جب میں ان سے محبت نہیں کرتا تو ان سے عقیدت کہاں سے رکھوں گا؟! اس لیے ﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ﴾ فرمایا۔

فائدہ:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: "لَمْ يَكْذِبْ إِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِلَّا ثَلَاثَ كَذَبَاتٍ، ثِنْتَيْنِ مِنْهُنَّ فِي ذَاتِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ قَوْلُهُ: ﴿اِنِّيْ سَقِيْمٌ﴾ [الصافات:89] وَقَوْلُهُ: ﴿بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ﴾ [الانبیاء:83] وَقَالَ: بَيْنَا هُوَ ذَاتَ يَوْمٍ وَسَارَةُ إِذْ أَتٰى عَلٰى جَبَّارٍ مِنَ الْجَبَابِرَةِ. فَقِيلَ لَهُ: إِنَّ هَا هُنَا رَجُلًا مَعَهُ امْرَأَةٌ مِنْ أَحْسَنِ النَّاسِ فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ فَسَأَلَهُ عَنْهَا فَقَالَ: مَنْ هٰذِهِ؟ قَالَ: "أُخْتِيْ" فَأَتٰى سَارَةَ قَالَ: يَا سَارَةُ! لَيْسَ عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ مُؤْمِنٌ غَيْرِيْ وَغَيْرَكِ وَإِنَّ هٰذَا سَأَلَنِيْ فَأَخْبَرْتُهُ أَنَّكِ أُخْتِيْ فَلَا تُكَذِّبِيْنِيْ. فَأَرْسَلَ إِلَيْهَا فَلَمَّا دَخَلَتْ عَلَيْهِ ذَهَبَ يَتَنَاوَلُهَا بِيَدِهٖ فَأُخِذَ فَقَالَ: اُدْعِي اللهَ لِيْ وَلَا أَضُرُّكِ فَدَعَتِ اللهَ فَأُطْلِقَ ثُمَّ تَنَاوَلَهَا الثَّانِيَةَ فَأُخِذَ مِثْلَهَا أَوْ أَشَدَّ فَقَالَ: اُدْعِي اللهَ لِيْ وَلَا أَضُرُّكِ فَدَعَتْ فَأُطْلِقَ فَدَعَا بَعْضَ حَجَبَتِهٖ فَقَالَ: إِنَّكُمْ لَمْ تَأْتُوْنِيْ بِإِنْسَانٍ إِنَّمَا أَتَيْتُمُوْنِيْ بِشَيْطَانٍ فَأَخْدَمَهَا هَاجَرَ فَأَتَتْهُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّيْ فَأَوْمَأَ بِيَدِهٖ: مَهْيَا! قَالَتْ: رَدَّ اللهُ كَيْدَ الْكَافِرِ أَوِ الْفَاجِرِ فِيْ نَحْرِهٖ وَأَخْدَمَ هَاجَرَ. قَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: تِلْكَ أُمُّكُمْ يَا بَنِيْ مَاءِ السَّمَاءِ!

(صحیح البخاری: ج1 ص473 کتاب الانبیاء باب قَوْلِ اللهِ تعالیٰ ﴿وَاتَّخَذَ اللهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے تین مرتبہ توریۃً بات کی تھی۔ دو ان میں سے خالص اللہ عزوجل کی رضا کے لیے تھے؛ ایک تو ان کا یہ فرمانا کہ "میں بیمار ہوں" اور دوسرا ان کا یہ فرمانا کہ "یہ کام تو ان کے بڑے نے کیا ہے۔" اور فرمایا کہ ایک مرتبہ ابراہیم علیہ السلام اور سارہ علیہا السلام ایک ظالم بادشاہ کی حدودِ سلطنت سے گزر رہے تھے۔ بادشاہ کو خبر ملی کہ یہاں ایک شخص آیا ہوا ہے اور اس کے ساتھ دنیا کی خوبصورت ترین عورت ہے۔ بادشاہ نے ابراہیم علیہ السلام کو کہلوا بھیجا اور سارہ علیہا السلام کے متعلق پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میری بہن ہیں۔ پھر آپ علیہ السلام حضرت سارہ علیہا السلام کے پاس آئے اور فرمایا کہ اے سارہ! یہاں اس زمین پر میرے اور تمہارے سوا اور کوئی بھی مومن نہیں ہے اور اس بادشاہ نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ تم میری بہن ہو۔ اس لیے اب

تم کوئی ایسی بات نہ کہنا جس سے میں جھوٹا بنوں۔ پھر اس ظالم نے حضرت سارہ کو بلوایا۔ جب وہ اس کے پاس گئیں تو اس نے ان کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن فوراً ہی ہاتھ شل ہو گیا۔ پھر وہ کہنے لگا کہ میرے لیے اللہ سے دعا کرو!، میں اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے اللہ سے دعا کی اور وہ چھوڑ دیا گیا۔ لیکن پھر دوسری مرتبہ اس نے ہاتھ بڑھایا اور اس مرتبہ بھی اسی طرح ہاتھ شل ہو گیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت اور پھر کہنے لگا کہ اللہ سے میرے لیے دعا کرو، میں اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ سارہ علیہا السلام نے دعا کی اور وہ چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے کسی نوکر کو بلا کر کہا کہ تم لوگ میرے پاس کسی انسان کو نہیں لائے ہو، یہ تو کوئی سرکش جن ہے۔ (واپسی پر) حضرت سارہ علیہ السلام کے لیے اس نے ھاجرہ علیہا السلام کو خدمت کے لیے تحفہ دے دیا۔ جب سارہ آئیں تو ابراہیم علیہ السلام کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ نے ہاتھ کے اشارہ سے ان کا حال پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کافر یا اس فاجر کے فریب کو اسی کے منہ پر دے مارا اور ہاجرہ علیہا السلام کو خدمت کے لیے دیا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "یَا بَنِیْ مَاءِ السَّمَاءِ!" (اے آسمانی پانی والو! یعنی اہل عرب) تمہاری والدہ یہی (یعنی حضرت ھاجرہ علیہا السلام) ہیں۔

علامہ بدر الدین محمود بن احمد بن موسیٰ العینی الحنفی (ت 855ھ) اس حدیث کے الفاظ "یَا بَنِیْ مَاءِ السَّمَاءِ!" کی شرح میں لکھتے ہیں:

أَرَادَ بِهِ الْعَرَب. لِأَنَّ هَاجَرَ أُمُّ إِسْمَاعِيلَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَالْعَرَبُ مِنْ نَسْلِهِ وَسُمُّوْا بِهِ لِأَنَّهُمْ سُكَّانُ الْبَوَادِيْ وَأَكْثَرُ مِيَاهِهِمْ مِنَ الْمَطَرِ.

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری: ج14 ص25)

ترجمہ: "یَا بَنِیْ مَاءِ السَّمَاءِ!" کے الفاظ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مراد اہل عرب ہیں کیونکہ حضرت ھاجرہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہیں اور عرب کے لوگ ان کی نسل سے ہیں۔ ان کو "آسمانی پانی والے" اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دیہاتوں کے رہنے والے تھے اور ان کی پانی کی گزراوقات اکثر طور پر بارش کے پانی سے ہوتی تھی۔

اس روایت میں "ثلاث کذبات" میں سے ہر جزء پر اعتراض ہے۔ ترتیب وار اعتراضات کے جوابات ملاحظہ ہوں:

اعتراض نمبر 2: جب قوم نے آپ کو میلہ پہ جانے کی دعوت دی تو...

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿٨٨﴾ فَقَالَ إِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿٨٩﴾﴾ (الصافات: 88، 89)

ترجمہ: آپ نے ایک نظر ستاروں کو دیکھا اور فرمایا میری طبیعت خراب ہے۔

حالانکہ آپ بالکل ٹھیک تھے۔ صحت مند بندے کا اپنے آپ کو بیمار کہنا جھوٹ ہوتا ہے۔

جواب:

جواب سے پہلے بطورِ تمہید ایک بات سمجھیں۔ "فنِ بلاغت" تین علوم پر مشتمل ہے: علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع۔

علم المعانی کی تعریف

علم تعرف به احوال اللفظ العربی التی یطابق بها اللفظ لمقتضی الحال۔

مختصر المعانی ص34

ترجمہ: علم المعانی وہ علم ہے جس میں متکلم کو مخاطب کی ذہنی صلاحیت اور مقتضی حال کے مطابق کلام کرنے کے قواعد سکھائے جاتے ہیں۔

علم البیان کی تعریف

هو علم يعرف به ايراد المعنى الواحد بتراكيب مختلفة فى وضوح الدلالة عليه

مختصر المعانی ص305

ترجمہ: ”علم بیان وہ علم ہے جس میں ایک معنی کو مختلف تراکیب کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ ایسی تعبیر کے ساتھ جس میں مقصود کی زیادہ سے زیادہ وضاحت ہو۔

علم البدیع کی تعریف

هو علم يعرف به وجوه تحسين الكلام بعد رعاية المطابقة و وضوح الدلالة

مختصر المعانی ص443

ترجمہ: علم البدیع وہ علم ہے جس میں مطابقت حال اور دلالت کی وضاحت کے بعد فصیح و بلیغ کلام کو لفظی و معنوی محاسن کے ذریعے مزید سنوارنے اور خوبصورت بنانے کے قواعد بیان کئے جاتے ہیں۔

علم البدیع میں ایک اصلاح ہے ”توریہ“

توریہ کی تعریف

يُطلَق لفظ له معنيان قريب و بعيد و يراد به البعيد

مختصر المعانی ص456

ترجمہ: ”ایسا لفظ بولا جائے جس کے دو معانی ہوں؛ ایک معنی قریبی اور دوسرا معنی بعیدی۔ مخاطب معنی قریبی سمجھے جبکہ متکلم کے ذہن میں معنی بعیدی ہو۔

نوٹ: اسے صنعتِ ایہام بھی کہتے ہیں

مثال:

[1]: ہجرت کی رات جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کو لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے راستہ میں کوئی آپ پوچھتا کہ ابو بکر! آپ کے ساتھ کون ہے؟

تو آپ جواب دیتے:

هٰذَا الرَّجُلُ يَهْدِيْنِي السَّبِيْلَ قَالَ فَيَحْسِبُ الْحَاسِبُ أَنَّهُ إِنَّمَا يَعْنِي الطَّرِيْقَ وَإِنَّمَا يَعْنِي سَبِيْلَ الْخَيْرِ.

(صحیح البخاری: کتاب فضائل الصحابۃ. بَابُ هِجْرَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ)

ترجمہ: یہ ایسا شخص ہے جو مجھے راستہ دکھاتا ہے لوگ دنیا کا راستہ سمجھتے جبکہ حضرت صدیق بھلائی، اسلام اور جنت کا راستہ مراد لیتے

[2]: عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِامْرَأَةٍ عَجُوزٍ: "إِنَّهُ لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوزٌ". فَقَالَتْ: وَمَا لَهُنَّ؟ وَكَانَتْ تَقْرَأُ الْقُرْآنَ. فَقَالَ لَهَا: "أَمَا تَقْرَئِينَ الْقُرْآنَ؟ ﴿اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۝٣٥ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۝٣٦﴾ [سورۃ الواقعۃ]

(مشکوٰۃ المصابیح: باب المزاح الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے بوڑھی عورت کو فرمایا کہ کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی اس نے پریشان ہو کے عرض کیا حضور بوڑھی عورتیں بھی تو قرآن پڑھتی ہیں پھر جنت میں کیوں نہ جائیں گی؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم نے قرآن میں یہ نہیں پڑھا کہ ہم ان عورتوں کو جوان بنا کر جنت میں داخل کریں گے۔

[3]: قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ ت1297ھ چونکہ جنگِ آزادی کی تحریک سے وابستہ رہے اس لیے انگریزی سرکار کی آپ پر ہمیشہ نظر رہتی۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ جب آپ کی گرفتاری کا وارنٹ آچکا تھا تو آپ اس وقت مسجد میں موجود تھے۔ ایک انگریز سپاہی آیا اور آپ سے ہی دریافت کیا کہ مولوی قاسم کہاں ہیں؟ آپ نے بڑی تیزی سے چند قدم پیچھے ہٹ کر فرمایا کہ مولوی قاسم ابھی یہیں تو تھے، انگریز افسر نے سمجھا کہ وہ اب یہاں سے جاچکے ہیں۔ وہ فوراً مسجد سے باہر حضرت کی تلاش میں چلا گیا اور حضرت نانوتوی اپنے حسنِ تدبیر سے انگریز کی اِس اُفتاد سے بچ گئے اور اُن کی گرفتاری ٹل گئی۔

(سوانح قاسمی از قلم مولانا سید مناظر احسن گیلانی: ج2 ص176، 177)

اب جواب سمجھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ﴿اِنِّیْ سَقِیْمٌ﴾ فرمانا یہ بطور توریہ تھا۔ قوم حضرت ابراہیم کے اس فرمان سے سمجھی کہ آپ جسمانی طور پہ بیمار ہیں جبکہ آپ کا مطلب تھا تمہارا کفر، شرک اور رسم و رواج دیکھ کر مجھے روحانی طور پہ بہت تکلیف ہوتی ہے۔

سلطان المحدثین ملا علی قاری رحمہ اللہ ت1014ھ فرماتے ہیں:

سقیم القلب لما فیه من الغیظ باتخاذکم النجوم آلهة أو بعبادتکم الأصنام

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح: باب بدء الخلق)

ترجمہ: آپ نے فرمایا میں تم سب کے ستاروں کی پرستش اور بتوں کی پوجا کرنے کی وجہ سے سخت غیظ و غضب کی حالت میں دل کا مریض ہو گیا ہوں۔

فأراد به إبراهیم علیه السلام المرض القلبی، وهو کونه مغموماً و مهموماً لعدم قبولهم الإیمان

(حاشیہ تلخیص البلاغۃ صفحہ 102)

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سُقم سے مرضِ قلبی مراد لیا اور مرضِ قلبی سے مراد آپ علیہ السلام کا ان کے عدمِ قبولیتِ ایمان کی وجہ سے پریشان رہنا ہے۔

اعتراض نمبر 3:

قوم کے میلے پر جانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود بتوں کو توڑا مگر قوم کے پوچھنے پر فرمایا:

﴿بَلْ فَعَلَهٗ ڰ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾﴾

(سورۃ الانبیاء: 63)

ترجمہ: بلکہ یہ حرکت اس بڑے بت کی ہے اگر یہ بول سکتے ہیں تو انہی سے پوچھ لو۔

خلاف واقعہ بات کہنا جھوٹ ہوتا ہے!

جواب:

جواب سے پہلے بطورِ تمہید ایک بات سمجھیں۔ "فن بلاغت" تین علوم پر مشتمل ہے: علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع۔ علم المعانی میں ایک اصطلاح ہے۔ تعریض۔

تعریض:

اس کا معنی یہ ہے:

أن یکنی المتکلّمُ بشیء عن آخر لا یُصرِّح به لیأخُذَهُ السّامِعُ لِنَفسِه ویعلم المقصودُ منهُ

خزانۃ الادب وغایۃ الارب ج2 ص407 لامام تقی الدین ابو بکر بن علی بن عبد اللہ الحموی ت 837ھ

ترجمہ: متکلم صریح کلام کی بجائے کنایہ میں بات کرے جس سے مقصد حاصل ہو جائے اور سامع سمجھ جائے۔

یعنی جب کلام میں صراحۃً ایک شخص کی طرف کسی فعل کی نسبت ہو اور اشارہ اور مراد کوئی دوسرا شخص ہو تو یہ تعریض ہے۔ تعریض سے مقصود مخاطب کو لاجواب کرنا اور چپ کرانا ہوتا ہے۔

جیسے ایک استاد کے پاس ایک طالب علم پڑھتا ہے۔ استاد اس سے پوچھتا ہے کہ تمہارے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟ طالب علم کہتا ہے کہ ان کی مٹھائی کی دکان ہے۔ استاد اسے کہتا ہے کہ بیٹا! آئندہ آؤ تو مٹھائی لیتے آنا۔ اگلے روز طالب علم آتا ہے لیکن مٹھائی ساتھ نہیں لاتا۔ اس وقت استاد کے پاس مٹھائی کوئی اور شخص لاتا ہے۔ اب استاذ اس طالب علم کو بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ بیٹا! مٹھائی کھالو! طالب علم پوچھتا ہے: استاذ جی! یہ مٹھائی کہاں سے آئی؟ استاذ جواب دیتا ہے کہ تمہارے والد ہی نے تو بھیجی ہے۔ استاد یہ بات اس انداز سے کرتا ہے کہ طالب علم خاموش ہو جاتا ہے۔ یہ تعریض ہے۔

اس تمہید کے بعد جواب سمجھیں کہ جب قوم نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ ہمارے معبودوں کا یہ حال کس نے کیا ہے؟ تو آپ علیہ السلام نے جواب دیا: ﴿بَلۡ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيۡرُهُمۡ هٰذَا﴾ کہ یہ کام تمہارے اسی بڑے نے کیا ہے! تمہارا عقیدہ ہے نا کہ یہ تمہارے بت سب کچھ کر سکتے ہیں، تمہارے نفع و نقصان کے مالک ہیں، موت و حیات کے مالک ہیں تو پھر ان سے پوچھو نا کہ کس نے یہ کام کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات بطور تعریض کے فرمائی تاکہ مخالفین خاموش ہو جائیں۔

اعتراض نمبر 4:

" عَنۡ أَبِي هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ بَيۡنَا هُوَ ذَاتَ يَوۡمٍ وَسَارَةُ إِذۡ أَتَى عَلَى جَبَّارٍ مِنَ الۡجَبَابِرَةِ، فَقِيلَ لَهُ: إِنَّ هَا هُنَا رَجُلًا مَعَهُ امۡرَأَةٌ مِنۡ أَحۡسَنِ النَّاسِ فَأَرۡسَلَ إِلَيۡهِ فَسَأَلَهُ عَنۡهَا فَقَالَ: مَنۡ هٰذِهِ؟ قَالَ: "أُخۡتِي"

(صحیح البخاری: کتاب الانبیاء. بَاب قَوۡلِ اللّٰهِ تَعَالَى وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبۡرَاهِيمَ خَلِيلًا)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک دن حضرت ابراہیم اور سیدہ سارہ ایسے علاقہ سے گزرے جہاں کا بادشاہ ظالم تھا اسے بتایا گیا کہ ایک مسافر ہے جس کے ساتھ خوب صورت عورت ہے بادشاہ نے حضرت ابراھیم سے پوچھا یہ عورت کون ہے؟ آپ نے فرمایا میری بہن ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی کو بہن کہا، جو کہ خلاف واقعہ ہے اور جھوٹ ہے اور جھوٹ بولنا عصمت کے منافی ہے۔

جواب:

اس اعتراض کا جواب سمجھنے کے لئے اس حدیث کا پس منظر دیکھیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جب مصر سے گزر ہوا تو آپ نے مصر پہنچنے سے پہلے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت سارہ سے یہ فرمایا کہ یہاں کا بادشاہ جابر و ظالم ہے۔ اگر کسی حسین عورت کو دیکھتا ہے تو اس کو زبردستی چھین لیتا ہے اور اس کے ساتھی مرد کو اگر وہ اس عورت کا شوہر ہو تو قتل کر ڈالتا ہے اور اگر کوئی دوسرا عزیز ہے تو اس سے کچھ نہیں کہتا۔ تم چونکہ میری دینی بہن ہو اور اس سرزمین میں میرے اور تمہارے علاوہ دوسرا کوئی مسلمان نہیں ہے اس لیے تم اس سے کہہ دینا کہ یہ میرا بھائی ہے اور میں کہہ دوں گا کہ یہ میری بہن ہے۔ چنانچہ بادشاہ کو جب آپ کی آمد کا علم ہوا تو اس نے دونوں کو پکڑوالیا۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی سارہ کے بارے میں یہ فرمایا کہ یہ میری بہن ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سارہ کو اپنی بہن کہنا اس کی وضاحت خود حدیث میں موجود ہے جب حضرت ابراہیم بادشاہ کی دربار سے واپس حضرت سارہ کے پاس آئے تو انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور بہن کہنے کی وجہ یہ بیان فرمائی:

"يَا سَارَةُ! لَيْسَ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ مُؤْمِنٌ غَيْرِي وَغَيْرَكِ"

(صحیح البخاری: کتاب الانبیاء باب قَوْلِ اللهِ تَعَالَى وَاتَّخَذَ اللهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا)

کہ اس وقت میرے اور تمہارے علاوہ یہاں کوئی مومن نہیں۔ یعنی آپ نے ایمانی اعتبار سے بہن فرمایا جو اپنی جگہ بالکل درست ہے۔

تنبیہ:

اپنے کسی روحانی رشتہ کے لئے وہ لفظ استعمال کرنا جو نسبی رشتہ کے لئے استعمال ہوتا ہے راوایات سے ثابت ہے۔

"عَنْ عُرْوَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ عَائِشَةَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ فَقَالَ لَهُ أَبُو بَكْرٍ: "إِنَّمَا أَنَا أَخُوكَ!" فَقَالَ: "أَنْتَ أَخِي فِي دِينِ اللهِ وَكِتَابِهِ وَهِيَ لِي حَلَالٌ"

(صحیح البخاری: کتاب النکاح باب تَزْوِيجِ الصِّغَارِ مِنَ الْكِبَارِ)

ترجمہ: حضرت عروہ سے روایت ہے حضور علیہ السلام نے حضرت ابو بکر صدیق سے حضرت عائشہ کا رشتہ مانگا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضور میں تو آپ کا بھائی ہوں (اس نسبت سے تو میری بیٹی عائشہ آپ کی بھتیجی ہوئی تو بھتیجی سے نکاح کیسے ہو سکتا ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ میرے دینی بھائی ہیں لہذا نکاح جائز ہے۔

اس حدیث پاک میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسلامی اور دینی بھائی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے "اخوت" کا لفظ استعمال فرمایا۔

فائدہ:

اس حدیث پاک میں یہ بتانا مقصود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس کو دیکھنے والا غلط سمجھے کیونکہ وہ اتنے صاحب عزیمت آدمی تھے۔ ہاں یہ تین واقعات ایسے ہیں کہ جن کو دیکھنے والا بظاہر یہ سمجھ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے بات غلط کی ہے اور – معاذ اللہ – جھوٹ بولا ہے حالانکہ یہ جھوٹ نہیں تھا۔ تو اس حدیث میں یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ صاحبِ عزیمت آدمی کی زندگی میں کئی بار ایسے احوال آتے ہیں کہ جب اس کو ایسا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس کو اختیار کیے بغیر خلاصی کی کوئی اور صورت نظر نہیں آتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بقیہ زندگی دیکھیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ علیہ السلام نمرود جیسے بادشاہ کے سامنے ڈٹ گئے، آگ میں جانا قبول کیا اور ہر مصیبت اور دکھ کو برداشت کیا لیکن یہاں صورتحال ایسی آگئی کہ جسے برداشت کرنا مشکل تھا اور اس ناقابل برداشت صورت سے بچنے کے لیے آپ علیہ السلام نے یہ تدابیر اختیار کر لیں۔ لہذا کوئی صاحبِ عزیمت آدمی کو اپنے کام کو حوادث سے بچانے کے لیے ایسی تدابیر اختیار کر لینی چاہییں جن کی شریعت میں گنجائش موجود ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اعتراضات کے جوابات

اعتراض نمبر 1:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک قبطی کو جان سے مار دیا۔ ارشاد باری ہے:

﴿وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۗ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶﴾﴾

(سورۃ القصص: آیت 15، 16)

ترجمہ: وہ شہر میں ایسے وقت میں داخل ہوئے جس وقت اس کے باشندے غفلت میں تھے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک تو ان کی برادرین کا تھا اور دوسرا ان کی دشمن قوم کا۔ اب جو شخص ان کی برادری کا تھا اس نے انہیں ان کی دشمن قوم کے آدمی کے مقابلے میں مدد کے لیے پکارا۔ اس پر موسیٰ نے اس کو مکا مارا جس نے اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر انہوں نے پچھتا کر کہا کہ یہ تو کوئی شیطان کی کارروائی ہے۔ بے شک وہ ایک کھلا دشمن ہے جو غلط راستے پر ڈل دیتا ہے۔ کہنے لگے: اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کر لیا، آپ مجھے معاف فرما دیجیے! چنانچہ اللہ نے انہیں معاف فرما دیا۔ یقیناً وہی ہے جو بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

ایک تو آپ نے قبطی کو ظلماً قتل کیا جو عصمت کے منافی ہے۔

دوسرا اسے ظلم فرمایا اور ظلم گناہ ہے۔

جواب نمبر 1:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ "هٰذَا عَمَلُ الشَّيْطٰنِ" بلکہ فرمایا: ﴿هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ یعنی میں نے جو کام کیا ہے یہ شیطانی عمل تو نہیں ہے کیونکہ میرا ارادہ قتل کا نہ تھا، میرا اصل مقصد ظالم سے مظلوم کو چھڑانا تھا جب نہ چھوڑا تو میں نے ایک مکا لگا دیا اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکا اور مر گیا۔ تو میرا عمل شیطانی عمل نہیں ہے لیکن اس طرح کا کام کوئی بندہ کر لے کہ ناحق کسی کو قتل کر دے تو وہ شیطانی عمل ہے۔ میرا عمل شیطانی عمل تو نہیں لیکن شیطانی عمل کی طرح ہے اس لیے میں اس پر بھی معافی مانگتا ہوں۔

جواب نمبر 2:

"ظلم" کا معنی ہے: "وَضْعُ الشَّيْئِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ" یہ مفہوم بہت وسیع ہے۔

[1]: کبھی ظلم کا اطلاق شرک پر ہوتا ہے۔

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾﴾

سورۃ لقمان: آیت 13

ترجمہ: اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

[2]: کبھی ظلم کا اطلاق گناہِ کبیرہ پر ہوتا ہے۔

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾﴾

(سورۃ النساء: 64)

ترجمہ: اور جب ان لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، اگر یہ اس وقت تمہارے پاس آکر اللہ سے مغفرت مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے تو یہ اللہ کو بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان پاتے۔

[3]: کبھی ظلم کا اطلاق ایسے کام پر بھی ہوتا ہے جو کر لیا جائے جبکہ اسے نہیں کرنا چاہئے۔

ضَربُ المَثل:

"مَنِ اسْتَرْعَى الذِّئْبَ فَقَدْ ظَلَمَ" جس نے بھیڑیئے سے رکھوالی کرائی تو اس نے ایسا کام کیا جو نہیں کرنا چاہئے تھا۔

تو یہاں بھی موسیٰ علیہ السلام جو فرما رہے ہیں ﴿رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ﴾ تو یہاں بھی ظلم کا معنی گناہ نہیں بلکہ ایسا کام کرنا مراد ہے جو نہیں کرنا چاہیے تھا۔

جواب نمبر 3:

بعض کام جو کہ فی الواقع گناہ نہیں ہوتے لیکن نبی اس کو اپنے لیے لفظ "گناہ" یا اس کے مرادف الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نبی کے انہی الفاظ کو نقل فرما دیتے ہیں اور یوں فرما دیتے ہیں کہ جس کو تو گناہ سمجھتا ہے ہم نے اس کو بھی معاف فرما دیا۔ اس سے سننے اور پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ گناہ ہے حالانکہ یہ گناہ ہوتا نہیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اس عمل کو "ظلم" سے تعبیر کیا اور فرمایا: "ظَلَمْتُ نَفْسِيْ"۔ اگر یہ گناہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرماتے: "ظَلَمْتَ نَفْسَكَ" اے موسیٰ! تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ اللہ نے کہیں یہ نہیں فرمایا۔ تو دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

جواب نمبر 4:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کام کیا وہ گناہ نہیں تھا لیکن وہ پھر بھی اسے اپنی غلطی کہنا یہ تو عصمت کی دلیل ہے نہ کی معصیت کی۔

مثال: ایک آدمی مسجد سے نکلا اور غلطی میں کسی اور کا جوتا پہن کر چلا گیا گھر جا کر معلوم ہوا کہ یہ جوتا تو میرا نہیں اب وہ واپس مسجد آتا ہے، دیکھتا ہے جس کا جوتا ہے وہ تلاش کر رہا ہے۔ یہ آدمی اس سے کہتا ہے: میری غلطی ہے آپ مجھے معاف کر دیں۔ اب یہ شخص معصیت کا مرتکب نہیں ہوا بلکہ غلطی سے ایک کام کر بیٹھا لیکن اس پہ معافی مانگنا یہ اس کے بڑے پن اور پاکدامن ہونے کی دلیل ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے اس فعل کو غلطی کہنا یہ ان کی عصمت و طہارت کی دلیل ہے۔

اعتراض نمبر 2:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ أُرْسِلَ مَلَكُ الْمَوْتِ إِلَى مُوسٰى عَلَيْهِمَا السَّلَامُ فَلَمَّا جَاءَهُ صَكَّهُ فَرَجَعَ إِلَى رَبِّهِ فَقَالَ أَرْسَلْتَنِي إِلَى عَبْدٍ لَا يُرِيدُ الْمَوْتَ فَرَدَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَيْنَهُ وَقَالَ ارْجِعْ فَقُلْ لَهُ يَضَعُ يَدَهُ عَلَى مَتْنِ ثَوْرٍ فَلَهُ بِكُلِّ مَا غَطَّتْ بِهِ يَدُهُ بِكُلِّ شَعْرَةٍ سَنَةٌ قَالَ أَيْ رَبِّ ثُمَّ مَاذَا قَالَ ثُمَّ الْمَوْتُ قَالَ فَالْآنَ {الحدیث}

(صحیح البخاری: کتاب الجنائز باب مَنْ أَحَبَّ الدَّفْنَ فِي الْأَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ أَوْ نَحْوِهَا)

ترجمہ: حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ملک الموت کو حضرت موسٰی علیہ السلا کی طرف بھیجا گیا۔ جب وہ ان کے پاس آئے تو موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تھپڑ دے مارا (جس سے ان کی آنکھ پھوٹ گئی) حضرت عزرائیل علیہ السلام اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا باری تعالیٰ! آپ نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا جو موت نہیں چاہتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھ کو ٹھیک کر دیا اور فرمایا: دوبارہ ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ وہ اپنا ہاتھ بیل کی کمر پہ رکھیں، ان کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آئیں گے اتنے سال ان کی عمر بڑھا دی جائے گی۔ ملک الموت واپس آئے اور یہ

بات کی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: اس کے بعد کیا ہو گا؟ عرض کی: موت!! تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: پھر میں ابھی ہی تیار ہوں۔

اگر عام آدمی کسی دوسرے کی آنکھ نکال دے تو فاسق اور باغی ہو گا تو نبی کا ایسا کرنا زیادہ ظلم اور فسق ہے جو عصمت کے منافی ہے۔

جواب:

چونکہ فرشتہ موسیٰ علیہ السلام کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل ہو گیا تھا اور انسانی شکل میں داخل ہوا تھا۔ اس سے موسیٰ علیہ السلام یہ سمجھے کہ کوئی انسان ہے جو بغیر اجازت کے میرے گھر میں داخل ہو گیا ہے اور جب کوئی انسان کسی انسان کے گھر میں بغیر اس کی اجازت کے داخل ہو تو جس کے گھر میں داخل ہوا ہو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ اس داخل ہونے والے کی آنکھ پھوڑ دے۔

" عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ أَنَّ رَجُلًا اطَّلَعَ عَلَيْكَ بِغَيْرِ إِذْنٍ فَخَذَفْتَهُ بِحَصَاةٍ فَفَقَأْتَ عَيْنَهُ مَا كَانَ عَلَيْكَ مِنْ جُنَاحٍ "

(صحیح مسلم: باب تحریم النظر فی بیت غیرہ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کوئی آدمی تیرے گھر میں بغیر اجازت کے جھانکے تو تو اسے کنکری مارے یا اس کی آنکھ پھوڑ دے تو تجھ پہ کوئی گناہ نہ ہو گا۔

سوال:

موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نبی کے پاس فرشتہ آئے اور نبی اسے پہچان نہ سکیں۔

جواب:

فرشتہ آئے اور یہ نہ بتائے کہ میں فرشتہ ہوں اور وحی لایا ہوں تو اس کو نہ پہچاننا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتے انسانی شکل میں آئے تھے تو آپ نے ان کو نہ پہچانا۔

﴿وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾﴾ (ھود:69)

ترجمہ: اور ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے، انہوں نے سلام کہا، ابراہیم نے بھی سلام کہا۔ پھر ابراہیم کو کچھ دیر نہ گزری تھی کہ وہ (ان کی مہمانی کے لیے) ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آئے۔

حضرت لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے آئے تو وہ بھی انہیں نہ پہچان سکے۔

﴿وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْۗءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿٧٧﴾﴾ (ھود:77)

ترجمہ: اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو وہ ان کی وجہ سے گھبرائے، ان کا دل پریشان ہوا اور وہ کہنے لگے: آج کا یہ دن بہت کٹھن ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام پر اعتراضات کے جوابات

اعتراض نمبر 1:

حضرت یوسف علیہ السلام نے عہدہ طلب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۵﴾ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۶﴾﴾

(سورۃ یوسف آیت 54،55،56)

ترجمہ: اور بادشاہ نے کہا کہ اسے میرے پاس لے آؤ، میں اسے خالص اپنا (معاون) بناؤں گا۔ چنانچہ جب (یوسف بادشاہ کے پاس گئے اور) بادشاہ نے ان سے باتیں کیں تو اس نے کہا: آج سے ہمارے پاس تمہارا بڑا مرتبہ ہوگا اور تم پر بھروسہ کیا جائے گا۔ یوسف نے کہا: آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کردیجیے، یقین رکھیے کہ مجھے حفاظت کرنا خوب آتا ہے اور میں (اس کام کا) پورا علم رکھتا ہوں۔ اور اس طرح ہم نے یوسف کو ملک میں ایسا اقتدار عطا کیا کہ وہ اس میں جہاں چاہیں اپنا ٹھکانا بنائیں۔ ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں اور نیک لوگوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ علیہ السلام نے عہدہ طلب کیا ہے جبکہ حدیث مبارک میں عہدہ طلب کرنے کی ممانعت ہے۔

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "يَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ سَمُرَةَ! لَا تَسْأَلِ الْإِمَارَةَ، فَإِنَّكَ إِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا وَإِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا."

(صحیح مسلم: ج2 ص48 کتاب الأیمان باب نَدْبِ مَنْ حَلَفَ يَمِينًا فَرَأَى غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا أَنْ يَأْتِيَ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ وَيُكَفِّرُ عَنْ يَمِينِهِ)

ترجمہ: حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: اے عبد الرحمٰن بن سمرہ! کبھی بھی عہدہ کی درخواست مت کرنا! کیونکہ اگر تمہیں کوئی عہدہ مانگنے کے بعد ملا تو تمہیں اسی کے سپرد کردیا جائے گا (یعنی اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید نہیں ہوگی) اور اگر وہ عہدہ تمہیں بغیر مانگے مل گیا تو (اللہ کی طرف سے) تمہاری مدد کی جائے گی۔

جواب:

بندہ عہدہ کا اہل نہ ہو یا اپنی ذات اور مفاد کے لئے عہدہ طلب کرے تو یہ جائز نہیں اور اگر انسان اس عہدہ کا اہل بھی ہو اور عہدہ نہ سنبھالنے کی صورت میں انسانیت کو نقصان پہنچنے، اشیاء کے ضیاع کا خطرہ ہو تو انہیں نقصان سے بچانے کے لئے اور انسانیت کو نفع پہنچانے کے لئے عہدہ طلب کرنا جائز بلکہ مستحب ہے کیونکہ یہاں عہدہ نہیں طلب کیا جارہا بلکہ خود عہدے کی بھی حفاظت کی جارہی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سمجھتے تھے کہ اگر میں یہ عہدہ سنبھال لوں تو زیادہ فائدہ ہوگا اگر کوئی دوسرا آگیا تو مخلوق خدا کو نقصان ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے فرمایا کہ مجھے وزیر خزانہ بنادو۔

اعتراض نمبر 2:

﴿فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾﴾

(سورۃ یوسف:70)

ترجمہ: پھر جب یوسف نے ان کا سامان تیار کر دیا تو پانی پینے کا پیالہ اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھوا دیا، پھر ایک منادی نے پکار کر کہا: اے قافلے والو! تم چور ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو چور کہا حالانکہ وہ چور نہ تھے۔ کسی آدمی پہ الزام لگانا عصمت کے منافی ہے۔

جواب:

یہ آواز لگانے والے حضرت یوسف علیہ السلام نہیں تھے بلکہ قرآن نے ﴿اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ﴾ کے الفاظ ذکر فرمائے ہیں۔

اعتراض نمبر 3:

یہ جو اعلان ہوا تھا اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے نہیں کیا لیکن ہوا تو یوسف علیہ السلام کے حکم سے تھا۔

جواب:

یہ اعلان یوسف علیہ السلام کے حکم سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ یہ تدبیر ہم نے ہی سکھائی تھی۔

﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾

(سورۃ یوسف:76)

ترجمہ: اس طرح ہم نے یوسف کی خاطر یہ تدبیر کی۔ اللہ کی یہ مشیت نہ ہوتی تو یوسف کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ لیتے اور ہم جس کو چاہتے ہیں اس کے درجے بلند کر دیتے ہیں اور جتنے علم والے ہیں ان کے اوپر ایک بڑا علم رکھنے والا موجود ہے۔

اللہ احکام کے مکلف نہیں ہیں، وہ قادرِ مطلق ذات جس طرح چاہے کرے، وہ کسی کا پابند نہیں۔ جیسے قرآن کریم میں ہے:

﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾

[سورۃ الانبیاء:23]

جیسے اگر کوئی انسان کسی کو ناحق قتل کر دے تو یہ جرم ہے لیکن اللہ پاک کسی کو موت دیدیں تو کوئی نہیں پوچھ سکتا اس لئے کہ انسان احکام کے مکلف ہیں اللہ پاک نہیں۔

یہی بات شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (ت 1394ھ) نے فرمائی ہے:

”یہ سب اللہ کے حکم سے تھا ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾ اور حکمت اس میں یہ تھی کہ یوسف علیہ السلام کے بعد

بنیامین کی مفارقت سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء کی تکمیل ہو جائے۔"

(معارف القرآن ج4ص153)

یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے منادی نے "چور" کہا اور ان کو واپس محل میں لایا گیا لیکن ان کے ساتھ چوروں کی طرح معاملہ نہیں کیا گیا۔ قانون کے مطابق چور کو چوری کی وجہ سے روک تو لیا جاتا تھا لیکن شاہی مہمان تو نہیں بنایا جاتا۔ یہ معاملہ سب دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے ہیں کہ یہ چور نہیں ہے کیونکہ شاہی مہمان کی طرح اس کا اعزاز واکرام کیا گیا ہے ہاں البتہ "چور" کہنا کسی تدبیر کی وجہ سے ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام پر اعتراضات کے جوابات

اعتراض نمبر1:

حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے بات نہ مانی تو قوم کو کہا کہ تم پہ عذاب آئے گا قوم نے کہا کب؟ تو فرمایا کہ تین دن میں اور پھر اللہ کے حکم کے بغیر ہی بستی چھوڑ کر چلے گئے جس پہ اللہ نے تنبیہ فرمائی اور کئی دنوں تک مچھلی کے پیٹ میں رہنا پڑا۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا مشروط وعدہ تھا۔ کب آئے گا؟ اس مدت کی تعیین نہیں تھی اب اس عذاب کی مدت متعین کرنا اور بستی چھوڑ کر جانا حضرت یونس علیہ السلام کا اجتہادی عمل تھا اور اجتہاد میں خطاء ہو سکتی ہے۔

جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا اور عمرہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے اور حدیبیہ میں آپ کو روک دیا گیا۔ آپ سمجھیں شاید اسی سال عمرہ نصیب ہو گا۔

اشکال:

اگر یہ آپ کا اجتہاد تھا تو اجتہاد میں خطا پہ بھی اجر ملتا ہے اس پہ حضرت یونس علیہ السلام کو سزا کیوں دی گئی؟

جواب:

مچھلی کے پیٹ میں رہنا بطور سزا کے نہیں بلکہ بطور امتحان تھا۔ اور اللہ تعالی ہر بندے سے اس کی حیثیت کے مطابق امتحان لیتے ہیں نبی کا مقام چونکہ بلند ہوتا ہے تو ان سے امتحان بھی سخت ہوتا ہے۔

عَنْ سَعْدٍ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُولَ اللهِ: أَيُّ النَّاسِ أَشَدُّ بَلَاءً؟ قَالَ الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ

سنن الترمذی باب ماجاء فی الصبر علی البلاء

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: سب سے زیادہ مشکلات کن لوگوں پہ آتی ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: سب سے زیادہ مشکلات انبیاء پہ آتی ہیں پھر جو ان کے جتنا قریب ہو۔

فائدہ نمبر1:

یہاں ایک ضابطہ یاد رکھ لیں کہ وہ کون سا عذاب ہے جسے دیکھنے پر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور کون سا عذاب ہے کہ جسے دیکھنے پر توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔

ضابطہ یہ ہے کہ جب آخرت کا عذاب سامنے آجائے تو توبہ قبول نہیں ہوتی۔ آخرت کے عذاب کا مشاہدہ ایک تو قیامت کے دن ہوگا اور ایک موت کے وقت ہوتا ہے، خواہ طبعی موت ہو یا عذاب کی وجہ سے ہو۔ جیسے فرعون کا عذاب میں مبتلا ہوتے وقت توبہ کرنا۔ نیز دنیا کا ایسا عذاب سامنے آئے جس کا نتیجہ موت نہ ہو اور آدمی توبہ کرلے تو بھی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک آدمی کو بہت سخت بخار آئے یا سخت حادثہ پیش آئے لیکن ایسا نہ ہو کہ موت کے آثار سامنے آجائیں تو اب اس حالت میں یہ شخص توبہ کرے تو توبہ قبول ہوگی۔

اب اس ضابطے کو دیکھا جائے تو قومِ یونس کی توبہ کا قبول ہونا اس ضابطہ کے خلاف نہیں ہے کیونکہ انہوں نے عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد توبہ نہیں کی بلکہ عذاب میں مبتلا ہونے سے پہلے عذاب کے آثار دیکھ کر توبہ کی، جو قبول ہوگئی۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ﴾

(سورۃ یونس:98)

ترجمہ: بستیوں والے ایسے وقت میں ایمان کیوں نہیں لاتے کہ ان کا ایمان لانا ان کو فائدہ دے سوائے قوم یونس کے، کہ وہ ایسے وقت میں ایمان لائے کہ ان کے ایمان نے ان کو نفع دیا

ابو الاعلیٰ مودودی کی غلطی:

اس موقع پر ابو الاعلیٰ مودودی صاحب سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ اس موقع پر عذاب نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ -معاذ اللہ- قوم کا نبی حضرت یونس علیہ سلام اپنے فریضۂ رسالت میں کوتاہی کر چکا تھا کہ قبل از وقت اپنی جگہ سے چلا گیا تھا، تو قوم پر جو حجت پوری ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہوئی۔ اللہ کا قاعدہ یہ ہے کہ اللہ حجت پوری کرنے کے بعد عذاب دیتا ہے۔ جب اس قوم پر حجت پوری نہ ہو سکی تو عذاب بھی ٹل گیا اور ان کی توبہ بھی قبول ہوئی۔ مودودی صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

> ”قرآن کے اشارات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت ادا کرنے میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر چھوڑ دیا تھا، اس لیے جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ واستغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا۔ قرآن میں خدائی دستور کے جو اصول وکلیات بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں کر دیتا۔ پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے خود ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا۔“

(تفہیم القرآن از مودودی صاجب: ج2 ص312 طبع 1964ء)

ہم کہتے ہیں کہ عذاب ٹلنے کی وجہ یہ ہے کہ قوم ابھی عذاب میں مبتلا ہی نہیں ہوئی تھی، ابھی ابتدائی آثار دیکھے تھے کہ اس نے توبہ کرلی اس لیے توبہ قبول ہوگئی۔ ایسی توبہ کا قبول ہونا یہ ضابطہ الٰہی کے خلاف نہیں۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ قوم یونس پر عذاب نہ آنے یا ان سے عذاب ٹلنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ضابطہ کے تحت توبہ کی جو قبول کرلی گئی۔ جبکہ مودودی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ان سے عذاب اس لیے ٹلا کہ یونس علیہ السلام نے فریضہ رسالت میں کوتاہی کی۔ حالانکہ مودوی صاحب کی یہ بات غلط ہے۔

نوٹ:

جو بات ہم نے کی ہے اس پہ مشہور مفسرین کے حوالہ جات ملاحظہ ہوں:

1: امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی المالکی (ت 671ھ):

"فَإِنَّ الْمُعَايَنَةَ الَّتِي لَا تَنْفَعُ التَّوْبَةُ مَعَهَا هِيَ التَّلَبُّسُ بِالْعَذَابِ كَقِصَّةِ فِرْعَوْنَ، وَلِهٰذَا جَاءَ بِقِصَّةِ قَوْمِ يُونُسَ عَلٰى أَثَرِ قِصَّةِ فِرْعَوْنَ لِأَنَّهُ آمَنَ حِينَ رَأَى الْعَذَابَ فَلَمْ يَنْفَعْهُ ذٰلِكَ، وَقَوْمُ يُونُسَ تَابُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ."

(الجامع لاحکام القرآن: ج21ص1546)

ترجمہ: عذاب کو دیکھنے سے توبہ قبول نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ بندہ جب عذاب میں مبتلا ہو جائے تو توبہ قبول نہیں ہوتی جیسے فرعون کا واقعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کا قصہ بیان کرنے کے بعد قوم یونس کا قصہ بیان کیا ہے کیونکہ فرعون نے عذاب دیکھا (یعنی اس میں مبتلا ہوا) اور ایمان لایا تو ایمان لانا نفع مند نہ ہوا اور قوم یونس نے عذاب دیکھنے (یعنی اس میں مبتلا ہونے) سے پہلے ایمان لائی تو اس کی توبہ قبول ہوئی۔

2: علامہ محمد بن یوسف المعروف ابن حیان الاندلسی (ت 745ھ):

وَقَالَ الزَّجَّاجُ: هٰؤُلَاءِ دَنَا مِنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَمْ يُبَاشِرْهُمْ كَمَا بَاشَرَ فِرْعَوْنَ، فَكَانُوْا كَالْمَرِيضِ الَّذِي يَخَافُ الْمَوْتَ وَيَرْجُو الْعَافِيَةَ، فَأَمَّا الَّذِي يُبَاشِرُهُ الْعَذَابُ فَلَا تَوْبَةَ لَهُ.

(البحر المحیط: ج5ص192)

ترجمہ: زجاج کہتے ہیں کہ قوم یونس وہ قوم ہے کہ عذاب ان کے قریب تو آیا لیکن عذاب نے ان کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا جبکہ عذاب نے فرعون کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ قوم یونس کی حالت اس مرض کی طرح ہو گئی جس کو موت کا ڈر ہو اور وہ عافیت کی امید رکھے۔ ہاں جس شخص کو عذاب گھیر لے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہو گی۔

3: قاضی ثناء اللہ پانی پتی (ت 1225ھ):

﴿إِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ﴾ فَإِنَّهُمْ آمَنُوْا قَبْلَ حَالَةِ الْغَرْغَرَةِ وَقَبْلَ رُؤْيَةِ الْعَذَابِ الْأُخْرَوِيِّ ﴿لَمَّآ اٰمَنُوْا﴾ فِي حَالَةِ الِاخْتِيَارِ قَبِلْنَا مِنْهُمُ الْإِيْمَانَ.

(التفسیر المظہری: ج5ص56)

ترجمہ: قوم یونس سکرات کی حالت میں مبتلا ہونے اور آخرت کا عذاب دیکھنے سے پہلے ایمان لائی۔ تو یہ لوگ جب حالت اختیار میں ایمان لائے تو ہم نے ان کا ایمان لانا قبول کر لیا۔

4: علامہ سید محمود آلوسی بغدادی (ت 1270ھ):

﴿لَمَّآ اٰمَنُوْا﴾ عِنْدَ مَا رَأَوْا أَمَارَاتِ الْعَذَابِ وَلَمْ يُؤَخِّرُوْا إِلٰى حُلُوْلِهٖ.

(روح المعانی: ج11ص191)

ترجمہ: قوم یونس اس وقت ایمان لائی جب اس نے عذاب کے صرف آثار دیکھے تھے، ابھی تک انہیں عذاب میں مبتلا نہیں کیا گیا تھا۔

5: مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانی (ت 1396ھ):

"خود آیت قرآن کی سیاق پر غور کیجیے تو الفاظ آیت کے یہ ہیں:

﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ إِيْمَانُهَآ إِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ﴾

جس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ دنیا کے عام بستی والوں کے متعلق بطورِ اظہار افسوس یہ ارشاد ہے کہ وہ ایسے کیوں نہ ہو گئے کہ ایمان اس وقت لے آتے جس وقت تک ایمان مقبول اور نافع ہوتا ہے یعنی عذاب میں یا موت میں مبتلا ہونے سے پہلے پہلے ایمان لے آتے تو ان کا ایمان

قبول ہو جاتا مگر قومِ یونس اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہ آثارِ عذاب دیکھ کر عذاب میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی ایمان لے آئی تو ان کا ایمان اور توبہ قبول ہو گی۔ آیت کا یہ واضح مفہوم خود بتلا رہا ہے کہ یہاں کوئی خدائی قانون نہیں توڑا گیا بلکہ عین خدائی دستور کے مطابق ان کا ایمان اور توبہ قبول کر لی گئی ہے۔"

(معارف القرآن: ج4 ص571)

اشکال:

حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے عذاب دیکھا توبہ کی تو ان کی توبہ قبول ہو گئی جبکہ فرعون نے عذاب دیکھا اور توبہ کی تو اس کی توبہ کیوں قبول نہ ہوئی؟

جواب:

حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے عذاب نہیں بلکہ آثارِ عذاب کو دیکھا تھا، عذاب میں مبتلا نہیں ہوئے تھے اس لیے توبہ قبول ہو گئی جبکہ فرعون نے محض آثار عذاب کو دیکھ کر توبہ نہیں کی بلکہ عذاب کو دیکھا اور عذاب میں مبتلا ہو کر توبہ کی اس لیے اس کی توبہ قبول نہ ہوئی۔ دونوں میں فرق بہت واضح ہے۔

فائدہ نمبر2:

حضرت یونس علیہ السلام کو تنبیہ کئے جانے کی وجہ معاذ اللہ کوئی گناہ نہیں تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ یونس علیہ السلام نے محسوس فرمالیا کہ اب میری قوم توبہ نہیں کرے گی اس لیے توبہ نہ کرنے کی وجہ سے تین دن بعد ان پر عذاب آئے گا۔ چنانچہ آپ علیہ السلام اپنی قوم کو یہ بات بتا کر بستی سے باہر تشریف لے گئے لیکن قوم نے توبہ کر لی تو عذاب ٹل گیا۔ اب اگر آپ علیہ السلام قوم کے پاس واپس تشریف لاتے تو قوم آپ کو جھٹلاتی کہ آپ تو کہہ رہے تھے کہ عذاب آئے گا لیکن عذاب تو نہیں آیا۔ نیز اس قوم کا دستور یہ تھا کہ جب کسی کے بارے میں ثابت ہو تا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے تو قوم اسے قتل کر دیتی۔ اب آپ کو اندیشہ ہوا کہ قوم مجھے جان سے مار ڈالے گی۔ ان اندیشوں کی وجہ سے آپ بستی میں نہ گئے بلکہ وہاں سے سمندر کی طرف چلے گئے تاکہ کسی دوسرے علاقے کی طرف چلے جائیں۔

یونس علیہ السلام نے جو تین دن بعد عذاب آنے کا فرمایا تو اس کی بنیاد تو یہ تھی کہ قوم کفر و شرک میں مبتلا رہے گی اس لیے ان پر عذاب آئے گا۔ جب قوم نے توبہ کر لی تو وہ وجہ بھی ختم ہو گئی اس لیے عذاب بھی ختم ہو گیا۔ تو یہ حقیقتاً جھوٹ ہی نہ ہوا لیکن آپ علیہ السلام نے اپنے ذہن میں یہ سمجھا کہ شاید قوم مجھے جھوٹا سمجھے اس لیے آپ نے ہجرت کر لی۔ نبی کے لئے ضابطہ یہ ہے کہ جب اللہ کا حکم آئے تو ہجرت کرے، بغیر صریح حکمِ خداوندی کے ہجرت نہ کرے لیکن یونس علیہ السلام نے صریح حکم آئے بغیر اپنے اجتہاد سے ہجرت کر لی۔ اس لیے اس پر تنبیہ آئی کہ آپ نے ہماری اجازت کے بغیر ہجرت کیوں کی ہے؟

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی (ت1270ھ) فرماتے ہیں:

وَكَانَ ذِهَابُهُ هٰذَا هِجْرَةً عَنْهُمْ لٰكِنَّهُ لَمْ يُؤْمَرْ بِهٖ.

(روح المعانی: ج17 ص83)

ترجمہ: آپ کا یہ سفر ہجرت کے طور پر تھا لیکن ابھی تک آپ کو ہجرت کی اجازت نہیں ملی تھی۔

ہم یہ بات پہلے کر چکے ہیں کہ ایسا موقع جہاں صریح نص موجود نہ ہو اور پیغمبر اجتہاد کرے اور اس میں خطا آ جائے تو اللہ کی طرف سے

وحی آجاتی ہے اور نبی کو اس اجتہاد پر باقی نہیں رکھا جاتا بلکہ اس کی اصلاح ہو جاتی ہے اور وہ اجتہادی خطا ختم ہو جاتی ہے۔ تو خلاصہ یہ ہوا کہ یہ عتاب اس وجہ سے نہیں تھا کہ اس کی بنیاد کوئی گناہ تھا بلکہ اجتہادی خطا پر تنبیہ کرنا مقصود تھا۔

اعتراض نمبر 2:

﴿وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٧﴾﴾

(سورۃ الانبیاء: آیت 87)

ترجمہ: اور مچھلی والے (پیغمبر یعنی یونس علیہ السلام) کو دیکھو جب وہ ناراض ہو کر چل پڑے ہوئے تھے اور یہ سمجھے تھے کہ ہم ان کی کوئی پکڑ نہیں کریں گے۔ پھر انہوں نے اندھیروں میں یوں آواز لگائی: (یا اللہ) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ہر عیب سے پاک ہے، بے شک میں قصور وار ہوں۔

اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام تو قدرت باری تعالی کا انکار فرما رہے ہیں جو عصمت کے منافی ہے

جواب:

لفظ نقدر کس سے مشتق ہے؟ اس میں تین احتمال ہیں:

۱: "قدرت" سے ۲: "قدر" سے ۳: "تقدیر" سے

اشکال تب ہے جب یہ "قدرت" سے مشتق ہو جبکہ یہاں یہ "قدر" یا "تقدیر" سے مشتق ہے۔

"قدر" سے مشتق ہونے کی صورت میں مطلب ہو گا تنگی کرنا جیسے ﴿يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ﴾ [الشوری: 12] میں بھی تنگی اور کمی کے معنی میں استعمال ہوا ہے حضرت یونس نے یہ گمان کیا کہ یہاں سے جانے پر اللہ مجھ پر تنگی نہیں کریں گے۔

اگر "تقدیر" سے مشتق ہونے کی صورت میں مطلب ہو گا کہ اللہ میرے بارے میں تنگی کا فیصلہ نہیں فرمائیں گے۔

مشہور مفسر علامہ ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم المعروف "علامہ خازن" (ت 741ھ) لکھتے ہیں:

"اَیْ لَنْ نَقْضِیَ عَلَیْهِ الْعُقُوْبَةَ"

(تفسیر خازن ج2 ص292)

کہ حضرت یونس سمجھتے تھے ہم ان کے بارے میں سزا کا فیصلہ نہیں کریں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆

خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ السلام پر اعتراضات کے جوابات

اعتراض نمبر 1:

﴿فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ اسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِکَ وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِبۡکَارِ ﴿۵۵﴾﴾

(سورۃ مؤمن:55)

ترجمہ: صبر سے کام لیں، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے معاملے پر استغفار کرتے رہیں اور صبح و شام اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیں۔

﴿فَاعۡلَمۡ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِکَ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مُتَقَلَّبَکُمۡ وَ مَثۡوٰىکُمۡ ﴿۱۹﴾﴾

(سورۃ محمد: آیت19)

ترجمہ: یاد رکھو کہ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور اپنے قصور پر بھی بخشش کی دعا مانگتے رہو اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی بھی اور اللہ تم سب کی نقل و حرکت اور تمہاری قیام گاہ کو خوب جانتا ہے۔

اگر نبی معصوم ہے تو "ذنب" کی نسبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کیوں کی؟

اور اگر نبی معصوم ہے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کا حکم کیوں دیا؟

جواب:

یہاں دو لفظ ہیں: (1) استغفار (2) ذنب

[۱]: جہاں تک بات ہے استغفار کی تو استغفار کا معنی ہے طلب غفران اور غفران کا معنیٰ ہے "الستر" ڈھانپنا اور ڈھانپنے کی دو صورتیں ہیں:

1: اس طرح ڈھانپ لیں کہ گناہ قریب ہی نہ آئے یعنی گناہ ہونے ہی نہ دیں۔ یہ صورت نبی کے لئے ہے۔

2: اس طرح ڈھانپ لیں کہ رسوائی نہ آنے دیں یعنی گناہ ہو جائے لیکن گناہ پر پردہ ڈال دیں کہ مخلوق پہ ظاہر نہ ہو۔ یہ صورت امت کے لئے ہے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر الرازی (ت604ھ) فرماتے ہیں:

وَجۡهٌ حَسَنٌ مُسۡتَنۡبَطٌ وَهُوَ أَنَّ الۡمُرَادَ تَوۡفِيۡقُ الۡعَمَلِ الۡحَسَنِ واجۡتِنَابُ الۡعَمَلِ السَّيِّءِ، وَوَجۡهُهُ أَنَّ الِاسۡتِغۡفَارَ طَلَبُ الۡغُفۡرَانِ، وَالۡغُفۡرَانُ هُوَ السَّتۡرُ عَلَى الۡقَبِيحِ وَمَنۡ عُصِمَ فَقَدۡ سُتِرَ عَلَيۡهِ قَبَائِحُ الۡهَوَى، وَمَعۡنَى طَلَبِ الۡغُفۡرَانِ أَنۡ لَا تَفۡضَحَنَا وَذٰلِكَ قَدۡ يَكُوۡنُ بِالۡعِصۡمَةِ مِنۡهُ فَلَا يَقَعُ فِيۡهِ كَمَا كَانَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ وَقَدۡ يَكُونُ بِالسَّتۡرِ عَلَيۡهِ بَعۡدَ الۡوُجُوۡدِ كَمَا هُوَ فِيۡ حَقِّ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنَاتِ.

(التفسیر الکبیر للرازی: ج28 ص61)

اس کی بہترین توجیہ یہ ہے کہ اللہ سے دعا مانگیں کہ اچھے اعمال کی توفیق ہو اور گناہوں سے بچنے کی توفیق دے۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ استغفار غفران طلب کرنے کا نام ہے اور غفران کا مطلب ہے قبیح چیز کو چھپا لینا اب جو آدمی گناہ سے بچ گیا تو اس کے حق میں قبیح چیز چھپ گئی اب "غفران" طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں رسوا نہ کرنا اور انسان کبھی گناہ نہ کر کے رسوائی سے بچ جاتا ہے جیسے نبی اور کبھی گناہ ہو جاتا ہے لیکن گناہ مخلوق کی نظر سے چھپ جاتا ہے جیسے عام مومن۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں یہ حکم فرمایا جارہاہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے غفران طلب کیجئے، اللہ تعالیٰ سے ستر مانگیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس طرح ڈھانپ کے رکھے کہ گناہ آپ کے قریب بھی نہ آئے۔ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت یافتہ اور صراط مستقیم پر گامزن ہیں اس کے باوجود ہدایت اور صراط مستقیم پر رہنے کی دعامانگتے ہیں تو یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو گناہوں سے بچایاہوا ہے لیکن آپ پھر بھی اللہ تعالیٰ سے غفران اور ستر مانگتے رہیے!!

[۲]: اس آیت میں ذنب کی اضافت ہے "ك" ضمیر کی طرف اور مراد حضور علیہ السلام کی ذات ہے اور لفظ کی اضافت ونسبت بدلنے سے معنیٰ بدل جاتا ہے جیسے لفظ محبت اگر ماں کی طرف منسوب ہو تو معنیٰ اور۔ بیٹی کی طرف منسوب ہو تو معنیٰ اور ہوتا ہے اگر بیوی کی طرف منسوب ہو تو معنیٰ اور۔ بہن کی طرف منسوب ہو تو معنیٰ اور ہوتا ہے۔ اسی طرح ذنب کی نسبت نبی کی طرف ہو تو معنیٰ اور امتی کی طرف ہو تو معنیٰ اور ہوتا ہے۔ نبی کی طرف نسبت ہو تو معنیٰ "غیر اولیٰ کام، نسیان، سہو، زلت، اجتہادی خطا" اور امتی کی طرف ہو تو معنیٰ "معصیت" ہے۔

خلاصہ یہ کہ آپ اللہ سے یہ دعامانگیں کہ یا اللہ! اگر کوئی خلافِ اولیٰ کام ہو تو بھی مجھے معاف فرما! اگر مجھ سے بھول ہوگئی ہو تب بھی معاف فرما! تو آپ ذات باری تعالیٰ سے یہ چیزیں مانگتے رہیے! اللہ بڑے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے تو بہت بڑے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے چھوٹے ہیں اور چھوٹا مانگتا ہی رہے یہی اس کی شان کے لائق ہے۔

فائدہ:

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر اولیٰ کام، نسیان، سہو، زلت اور اجتہادی خطا صادر ہو تو ان کو استغفار کا حکم دینا ایسے ہی ہے جیسے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ایک دعا سکھائی تھی کہ یہ پڑھا کریں:

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ أَنْ أُشْرِكَ بِكَ وَأَنَاأَعْلَمُ، وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا أَعْلَمُ.

(الادب المفرد للبخاری: ج1 ص250 باب فضل الدعاء)

ترجمہ: اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں کسی شے کو جان بوجھ کر تیرا شریک بناؤں اور تیری بخشش مانگتا ہوں اس (شرک) کی جسے میں نہیں جانتا۔

یہاں اس شرک سے بھی پناہ مانگی جارہی ہے جس کو بندہ جانتا ہی نہیں لیکن معافی پھر بھی مانگی جارہی ہے کہ جو کام بندے نے انجانے میں کیا تو اس پر بھی معافی طلب کر رہا ہے۔ اسی طرح اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فرمایا جارہاہے کہ آپ اللہ سے معافی مانگیں! انجانے میں کوئی کام ہوا تو تب بھی معافی مانگیں۔

اعتراض نمبر2:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنۢبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾

(سورۃ الفتح: 2،1)

ترجمہ: ہم نے آپ کو کھلم کھلا فتح عطا کی ہے تا کہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی تمام خطاؤں کو معاف کردے۔

اس آیت میں بھی ذنب کی مغفرت کی بات ہو رہی ہے اگر نبی معصوم ہو تو پھر مغفرت ذنب کا کیا معنیٰ؟

جواب:

"غفران" کا معنٰی ہے ڈھانپ لینا اور "ذنب" کا معنٰی ہے ویسے تو دُم ہے لیکن یہاں مراد الزام ہیں کیونکہ جس طرح دُم جانور کے پیچھے ہوتی ہے اس طرح الزام بھی عموماً کمر کے پیچھے لگاتا ہے "ماتقدم" کا معنٰی ہے وہ دور جو گزر چکا ہے یعنی مکی زندگی اور "ماتاخر" کا معنٰی ہے وہ دور جو بعد میں آیا یعنی مدنی زندگی اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے پیغمبر ہم نے آپ کو فتح عطا کر کے مخالف کو موافق، معترض کو محب بنادیں گے اس وقت جو آپ پر الزامات لگا رہے ہیں وہ آپ کی مدح کریں گے۔

آیت میں "ذنب" کا معنٰی گناہ ہے ہی نہیں ورنہ تو آیت کا مطلب ہو گا کہ ہم نے آپ کو فتح عطا فرمائی تا کہ آپ کے گناہ معاف کر دیں! اس کے لئے تو یوں کہنا چاہئے تھا کہ "اِنَّا تُبْنَا عَلَيْكَ لِيَغْفِرَ لَكَ اللهُ" کہ ہم نے آپ کو توبہ کی توفیق دی تا کہ آپ کے گناہ معاف کریں۔ فتح کے ساتھ تو یہ فرمانا چاہیے تھا کہ ہم نے فتح عطا کی تا کہ آپ ظلم کا بدلہ لیں، خلافت قائم کریں، حدود شرعیہ کا نفاذ کریں، اپنی طاقت کا اظہار کریں۔

خلاصہ کلام: اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ "ذنب" کا معنی اس آیت میں "گناہ" نہیں ہے کہ ہم نے فتح دے کر آپ کے گناہ معاف کر دیے ہیں۔ بلکہ یہاں ذنب کا معنی الزام ہے کہ ہم نے آپ کو فتح دی تا کہ آپ پہ لگنے والے الزامات کو ختم کر دیں۔

اعتراض نمبر 3:

﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ ۖۗ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِیْلًا ﴿۷۳﴾ وَلَوْلَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَیْهِمْ شَیْــًٔا قَلِیْلًا ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا ﴿۷۵﴾﴾

(سورۃ الاسراء: آیت 73، 74، 75)

ترجمہ: اور (اے پیغمبر!) جو وحی ہم نے تمہارے پاس بھیجی ہے یہ (کافر) لوگ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس سے ہٹانے لگے تھے تا کہ اس کے بجائے کوئی اور بات ہمارے نام پر گھڑ کر پیش کرو تو اس صورت میں یہ تمہیں اپنا گہرا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو آپ بھی ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے اور اگر ایسا ہو جاتا تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوگنی سزا دیتے۔ اور مرنے کے بعد بھی دوگنی، پھر تمہیں ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ ملتا۔

معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کی طرف مائل ہو چلے تھے اور کفر کی طرف میلان بھی گناہ ہے۔

جواب نمبر 1:

آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی طبیعت و فطرت بھی بے حد سلیم ہے اتنی کہ آپ گناہ کو پسند ہی نہیں فرماتے اور اس پہ کئی قرائن اسی آیت میں موجود ہیں۔ مثلاً

1: ﴿كِدْتَّ﴾ 2: ﴿تَرْكَنُ﴾ 3: ﴿شَيْــًٔا﴾

4: ﴿شَيْــًٔا﴾ پہ تنوین تنکیر 5: ﴿قَلِيْلًا﴾ 6: ﴿قَلِيْلًا﴾ پہ تنوین تنکیر

جواب نمبر 2:

سائل معصوم کا معنٰی نہیں سمجھ رہا۔ ہم پہلے یہ بات کر چکے ہیں کہ معصوم کا معنی یہ نہیں کہ نبی گناہ سے بچتا ہے بلکہ معصوم کا معنٰی ہے کہ اللہ اپنے نبی کو گناہ سے بچاتا ہے اور یہاں یہی بات کی جا رہی ہے کہ ہم نے آپ کو گناہ سے بچایا۔ اس کا معنی یہ بھی نہیں کہ اگر ہم نہ بچاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ گناہ کر لیتے بلکہ معنی یہ ہے کہ آپ کی طبیعت گناہ کی طرف مائل نہیں ہوتی پھر بھی ہم نے آپ کو گناہ سے بچایا ہے۔ یہ تو کمال عصمت ہے۔

اعتراض نمبر 4:

"عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ كَانَتْ إِحْدَانَا إِذَا كَانَتْ حَائِضًا فَأَرَادَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يُبَاشِرَهَا أَمَرَهَا أَنْ تَتَّزِرَ فِي فَوْرِ حَيْضَتِهَا ثُمَّ يُبَاشِرُهَا".

(صحیح البخاری: کتاب الحیض باب مُباشَرَۃِ الْحَائِضِ)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ازواج مطہرات میں سے کسی کو حیض آتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مباشرت فرمانا چاہتے تو آپ بیوی کو حکم دیتے کہ غلبہ حیض کی حالت میں ازار باندھ لے اس کے بعد آپ مباشرت فرماتے۔

جبکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حائضہ عورت سے ہمبستری کرنے سے منع فرمایا ہے:

﴿قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ﴾

(سورۃ البقرۃ:222)

ترجمہ: آپ فرما دیجیے وہ (حیض) گندگی ہے، لہذا حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان سے قربت مت کرو!

گویا نبی ایسا کام کر رہا ہے کہ جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔

جواب:

"مباشرت" کا اصلی اور حقیقی مفہوم ہمبستری نہیں بلکہ محض بدن کا کوئی حصہ بدن کے کسی حصہ سے ملانا ہے۔ ہاں البتہ کبھی کبھی ہمبستری کے لئے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے۔

امام ابو بکر جصاص الحنفی (ت 370ھ) فرماتے ہیں:

يَحْتَمِلُ اللَّفْظُ حَقِيْقَةَ الْمُبَاشَرَةِ الَّتِيْ هِيَ إِلْصَاقُ الْبَشَرَةِ بِالْبَشَرَةِ مِنْ أَيِّ مَوْضِعٍ كَانَ مِنَ الْبَدَنِ وَ يَحْتَمِلُ أَنْ تَكُوْنَ كِنَايَةً عَنِ الْجِمَاعِ.

(احکام القرآن: ج1 ص306 باب ما يجوز للمعتكف أن يفعله)

ترجمہ: اس آیت میں یہ بھی احتمال ہے کہ مباشرت کا حقیقی معانی مراد ہو یعنی بدن کا بدن سے ملانا خواہ جس حصہ سے ہو۔ نیز یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جماع سے کنایہ ہو۔

امام ابو بکر الجصاص رحمہ اللہ کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ "مباشرت" کا حقیقی معنی بدن کا کوئی حصہ بدن کے کسی حصہ سے ملانا ہے۔ ہاں جماع کے لیے کنایۃً استعمال ہو سکتا ہے۔

"مباشرت" کے حقیقی معنی "بدن کا کوئی حصہ بدن کے کسی حصہ سے ملانا" پر دلیل یہ حدیث ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ "کتاب النکاح" میں "بَابٌ لَا تُبَاشِرِ الْمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ" کے تحت لائے ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَا تُبَاشِرُ الْمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ فَتَنْعَتَهَا لِزَوْجِهَا كَأَنَّهُ يَنْظُرُ إِلَيْهَا."

(صحیح البخاری: ج2 ص788 کتاب النکاح باب لا تباشر المراۃ المراۃ)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی عورت دوسری عورت سے اپنا بدن نہ لگائے، پھر اپنے شوہر سے اس کے بارے میں اس طرح بیان کرے کہ گویا اس کا شوہر اسے (یعنی دوسری عورت کو) دیکھ رہا ہے (کیونکہ اس سے اس شوہر کے دل میں دوسری عورت کا خیال آئے گا جو فتنہ وفساد کا باعث ہو گا)

تو صحیح البخاری کی اس روایت "فَأَرَادَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ أَنْ يُبَاشِرَهَا" میں بھی مباشرت کا حقیقی معنی یعنی "بدن کا بدن سے ملانا" مراد ہے، کنائی معنی "جماع" مراد نہیں۔ اس پر دلیل خود اسی حدیث مبارک میں "أَمَرَهَا أَنْ تَتَّزِرَ فِي فَوْرِ حَيْضَتِهَا ثُمَّ يُبَاشِرُهَا" کے الفاظ ہیں۔

فائدہ نمبر 1:

"مباشرت" کا حقیقی معنی تو بدن کا کوئی حصہ بدن کے کسی حصہ سے ملانا ہے لیکن یہ لفظ مجامعت اور ہمبستری کے لیے ادب و حیا کی وجہ سے کنایۃً استعمال ہوتا رہتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں عام طور پر یہ بات کہہ دی جاتی ہے کہ "خاوند جب بیوی کے پاس جائے تو یہ دعا پڑھے۔" اسی طرح کہا جاتا ہے کہ "رمضان مبارک میں خاوند اگر بیوی کے پاس چلا گیا تو روزے کی قضا اور کفارہ لازم ہو گا۔" تو اس جیسے کلام میں "پاس جانے" کا حقیقی مفہوم مراد نہیں ہوتا بلکہ محض ادب اور حیا کی وجہ سے مجامعت کو ان جیسے الفاظ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

فائدہ نمبر 2:

ایام حیض و نفاس میں بیوی سے ہمبستری کرنا حرام ہے بلکہ ناف سے لے کر گھٹنے تک کے حصے کو بلا پردہ مس کرنا بھی جائز نہیں۔ اس کے علاوہ باقی بدن کو مس کرنا جائز ہے۔

علامہ محمد امین ابن عابدین شامی حنفی (ت 1252ھ) لکھتے ہیں:

فَيَجُوزُ الِاسْتِمْتَاعُ بِالسُّرَّةِ وَمَا فَوْقَهَا وَالرُّكْبَةِ وَمَا تَحْتَهَا وَلَوْ بِلَا حَائِلٍ، وَكَذَا بِمَا بَيْنَهُمَا بِحَائِلٍ بِغَيْرِ الْوَطْءِ.

(رد المحتار: ج2 ص390)

ترجمہ: (حالت حیض میں عورت کے) ناف اور اس کے اوپر کے حصہ اسی طرح گھٹنہ اور اس کے نیچے کے حصہ سے نفع اٹھانا جائز ہے اگرچہ بغیر پردہ کے ہو۔ اسی طرح ناف اور گھٹنے کے درمیانی حصہ سے پردہ کے ساتھ بغیر مجامعت کیے نفع اٹھانا بھی جائز ہے۔

فائدہ نمبر 3:

عقیدہ عصمت انبیاء علیہم السلام کو دلائل کے ساتھ سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ انتہائی مفید ہے۔

1. عصمۃ الانبیاء علیہم السلام۔ امام ابو عبد اللہ محمد بن عمر الحسین بن علی المعروف فخر الدین رازی رحمہ اللہ ت606ھ
2. ترجمان السنۃ جلد سوم۔ مولانا بدر عالم میر ٹھی رحمہ اللہ ت1385ھ۔
3. الأستاذ المودودي وشيئ من حياته وأفكاره ۔ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ ت1397ھ
4. مودودی صاحب کے افکار و نظریات۔ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ ت1397ھ
5. مودودی مذہب۔ مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ ت2004ء
6. ادیان باطلہ اور صراط مستقیم۔ مفتی محمد نعیم رحمہ اللہ ت1441ھ
7. مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام۔ افادات: مولانا مغفور اللہ صاحب۔ جمع و ترتیب مولانا مفتی فضل غفور حقانی صاحب۔